الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی و علمی ترجمان

ماہ نامہ

اشرفیہ

مبارک پور

فروری
2026

شعبان المعظم

عملی تربیت کا مہینہ

مبارک حسین مصباحی

یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام فرد اور اجتماع کو ایک دوسرے سے الگ نہیں دیکھتا۔ دل کی اصلاح، زبان کی حفاظت، نگاہ کی پاکیزگی، دیانت، امانت؛ یہ سب اجتماعی نجات کی بنیادیں ہیں۔ امت کے عظیم مسائل پر بات کرنا ضروری ہے، مگر یہ بات اسی وقت بامعنی ہوتی ہے جب فرد کے اندر تقویٰ، خوفِ خدا اور اخلاقی استقامت موجود ہو۔ دل جب تقویٰ سے خالی ہو تو فساد کا گھر ہوتا ہے، اور سیاست جب شریعت کے اصولوں سے ہٹتی ہے تو قوموں کو ذلت کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اسی طرح عبادت اگر سماجی شعور سے خالی ہو تو وہ محض ایک ذاتی عمل بن کر رہ جاتی ہے۔ اسلام ان سب کو جوڑ کر دیکھتا ہے، اور ماہِ شعبان اسی جامع فکر کی عملی تربیت کا مہینہ ہے۔ (مہتاب بیانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبد العزیز قدس سرہٗ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی و علمی ترجمان

ماہ نامہ

اشرفیہ

مبارک پور

زیر سرپرستی

عزیز ملت حضرت علامہ شاہ

عبد الحفیظ عزیزی

سربراہِ اعلیٰ

الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

THE ASHRAFIA MONTHLY Mubarakpur. Azamgarh (U.P.) India. 276404

جلد نمبر 51 شمارہ 2

فروری 2026ء

شعبان 1447ھ

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ : مبارک حسین مصباحی

منیجر : محمد محبوب عزیزی

تزئین کار : مہتاب پیامی

مجلس مشاورت

مولانا محمد احمد مصباحی

مفتی محمد نظام الدین رضوی

مولانا محمد ادریس بستوی

مولانا محمد عبد المبین نعمانی

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ

دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور اعظم گڑھ یو۔ پی۔ ۲۷۶۴۰۴

+91 9935162520 (Manager)

زرِ تعاون

قیمت عام شمارہ: 30 روپے

سالانہ (بذریعہ سادہ ڈاک) 300 روپے

سالانہ (بذریعہ رجسٹری) 600 روپے

سری لنکا، بنگلا دیش، پاکستان، سالانہ

750 روپے

دیگر بیرونی ممالک

$25 امریکی ڈالر £20 پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org

Email : ashrafiamonthly@gmail.com

mubarakmisbahi@gmail.com

info@aljamiatulashrafia.org

BHIM UPI Payments Accepted at

ASHRAFIA MONTHLY

ASHRAFIA MONTHLY

A/c No. 3672174629

Central Bank Of India

Branch : Mubarakpur IFSC : CBIN0284532

اکاؤنٹ میں رقم جمع کرنے کے بعد آفس کے نمبر پر فون کریں یا بذریعہ ڈاک مطلع کریں۔ (منیجر)

مولانا محمد ادریس بستوی نے فیضی کمپیوٹر گرافکس، گورکھ پور سے چھپوا کر دفتر ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

مشمولات

اداریہ		بیداری کی خاموش دستک	مہتاب پیامی	5
قرآنیات	تفہیم قرآن	چاند اور سورج کا ایک حساب ہے	مولانا محمد حبیب اللہ بیگ ازہری	9
فقہیات	آپ کے مسائل	حضور بے شائبہ مجاز زندہ ہیں	مفتی محمد نظام الدین رضوی	11
خطبات	گفتگو	نمونہ اسلاف	محمد نظام الدین المصباحی	13
نظریات	فکر امروز	عصری علوم اور علماے ہند	نبیل احمد غزالی	15
اسلامیات	شعاعیں	حدیث موضوع سے متعلق افادات رضویہ	سید حدیر الحسن شاہ	18
شخصیات	انوار حیات	حضرت نظام الدین اولیا کی حیات اور افکار	شمس آغاز	21
سیاسیات	آئینۂ عالم	"وندے ماترم" عقیدۂ توحید پر کاری ضرب	حافظ افتخار احمد قادری	24
سماجیات	آس پاس	لوگ کیا کہیں گے !!!	انیس الرحمٰن حنفی رضوی	27
تاریخیات	یاد ماضی	تاریخ اور تاریخی مطالعات	مہتاب پیامی	30
طبیات	حفظان صحت	آسان گھریلو نسخوں سے سرمائی خشکی کا علاج	ڈاکٹر ام فرح (ایم ڈی)	39
بزم خواتین	چراغ خانہ	بے سہارا عورت اور معاشرتی نیتیں	سلمٰی شاہین امجدی	40
بزم دانش	فکر و نظر	نکاح نسل انسانی کی بقا کا ضامن	* مجیب الرحمٰن ثقافی * محمد اشفاق عالم امجدی	43
ادبیات	گوشۂ ادب	مفتی شمیم القادری کی نعتیہ شاعری	محمد قمر الزماں مصباحی	48
	نقد و نظر	خانوادۂ رضا کی علمی و ادبی جہتیں	مولانا محمد شاہد رضا نعمانی مصباحی	50
مکتوبات	صدائے بازگشت	* ذوالنورین * حافظ افتخار احمد قادری		53
سرگرمیاں	عالمی خبریں	بوسنیا میں شیخ صفوت خلیلو فیتش کو "حسن افندی شکابور ایوارڈ" سے نوازا گیا		55
	خیر و خبر	* دارالعلوم قادریہ چریاکوٹ میں جشن صدیق اکبر * ترپورہ میں مسجد کی بے حرمتی * جے پور میں فرقہ وارانہ تصادم		56
منظومات	خیابانِ حرم	مناقب حافظ ملت	شعرائے مبارک پور	58

اداریـــــــہ

بیداری کی خاموش دستک

مہتاب پیامی

ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں واقعات کی رفتار نے ہماری سوچ کو مفلوج کر دیا ہے، ایک حادثہ گزرتا نہیں کہ دوسرا سامنے آجاتا ہے، ہمارے دل و دماغ گردش زمانہ میں بے طرح الجھے ہوئے ہیں۔ سیاست، جنگ، معاش، میڈیا اور روزمرہ کی کشمکش نے ہمارے دل کو منتشر اور ذہن کو تھکا دیا ہے، مگر ہمیں اس الجھاو سے، اس کشمکش سے آزادی کی طرف نکلنا ضروری ہے، ہمیں اس کی طرف ایک قدم بڑھانے کی ضرورت ہے جو یہ کہتا ہے کہ تم میری طرف ایک قدم قریب آؤ تو میں تمھاری طرف دس قدم قرب آؤں گا، ہمیں اس سے ذرا سی محبت کرنے کی دیر ہے پھر وہ ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرے گا۔

اس وقت ہم لوگ ماہِ رجب کو الوداع کہہ کر ماہِ شعبان کے روحانی اور عرفانی ماحول میں داخل ہونے والے ہیں۔ اس مہینے کی اپنی ایک الگ روحانی شناخت ہے۔ یہ مہینہ مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں امید کی ایک روشن کرن کی طرح ہے، یہ مہینہ بہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ دروازہ ابھی بند نہیں ہوا، تم دستک دے کر تو دیکھو۔ ہماری یہ تحریر اسی دستک کی ایک ادنی سی کوشش ہے، تاکہ غفلت کے شکار دل کو بیداری کی صبح امید افزا مل سکے۔

ماہِ رجب کے حوالے سے کہنے والے نے کہا۔

مَضَى رَجَبٌ وَمَا أَحْسَنْتَ فِيهِ ۔۔۔ وَهَذَا شَهْرُ شَعْبَانَ الْمُبَارَكْ

فَيَا مَنْ ضَيَّعَ الْأَوْقَاتَ جَهْلاً ۔۔۔ بِحُرْمَتِهَا أَفِقْ وَاحْذَرْ بَوَارَكْ

فَسَوْفَ تُفَارِقُ اللَّذَّاتِ قَسْرًا ۔۔۔ وَيُخْلِي الْمَوْتُ كُرْهًا مِنْكَ دَارَكْ

تَدَارَكْ مَا اسْتَطَعْتَ مِنَ الْخَطَايَا ۔۔۔ بِتَوْبَةِ مُخْلِصٍ وَاجْعَلْ مَدَارَكْ

عَلَى طَلَبِ السَّلَامَةِ مِنْ جَحِيمٍ ۔۔۔ فَخَيْرُ ذَوِي الْجَرَائِمِ مَنْ تَدَارَكْ

(لطائف المعارف—امام ابن رجب الحنبلی)

- رجب گزر گیا اور تم نے اس میں کوئی بھلائی نہ کمائی، اور یہ ہے شعبان کا مبارک مہینہ۔
- اے وہ شخص جس نے وقتوں کی حرمت کو نہ پہچان کر انھیں ضائع کر دیا، ہوش میں آ اور اپنی ہلاکت سے ڈر۔
- یاد رکھ! لذتیں ایک دن زبردستی تجھ سے چھن جائیں گی، اور موت نہ چاہتے ہوئے بھی تجھے تیرے گھر سے جدا کر دے گی۔
- ابھی جو ممکن ہو، سچی توبہ کے ذریعے اپنے گناہوں کی تلافی کر لے۔
- دوزخ سے نجات کو اپنا مقصد بنا، کہ گناہ گاروں میں بھی سب سے بہتر وہی ہے جو سنبھل جائے۔

شاعر بندے کو جھنجھوڑتے ہوئے اسے وقت کی حرمت یاد دلاتا ہے، اور اس تلخ مگر سچی حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ لذتیں ہمیشہ ساتھ نہیں رہتیں، اور موت ایک دن زبردستی انسان کو اس کے سارے اپنوں اور سپنوں سے جدا کر دیتی ہے۔ ابھی زندگی موجود ہے، انسان اگر چاہے تو سنبھل سکتا ہے، گمراہیوں کے جال سے نکل سکتا ہے، راہِ راست پر چل سکتا ہے، اور سچی توبہ کے ذریعے

اپنی بربادی کو نجات میں بدل سکتا ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام فرد اور اجتماع کو ایک دوسرے سے الگ نہیں دیکھتا۔ دل کی اصلاح، زبان کی حفاظت، نگاہ کی پاکیزگی، دیانت، امانت؛ یہ سب اجتماعی نجات کی بنیادیں ہیں۔ امت کے عظیم مسائل پر بات کرنا ضروری ہے، مگر یہ بات اسی وقت بامعنی ہوتی ہے جب فرد کے اندر تقویٰ، خوفِ خدا اور اخلاقی استقامت موجود ہو۔ دل جب تقویٰ سے خالی ہو تو فساد کا گھر ہوتا ہے، اور سیاست جب شریعت کے اصولوں سے ہٹتی ہے تو قوموں کو ذلت کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اسی طرح عبادت اگر سماجی شعور سے خالی ہو تو وہ محض ایک ذاتی عمل بن کر رہ جاتی ہے۔ اسلام ان سب کو جوڑ کر دیکھتا ہے، اور ماہِ شعبان اسی جامع فکر کی عملی تربیت کا مہینہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ماہِ شعبان ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم اسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ إِلَّا رَمَضَانَ. وَمَا رَأَيْتُهُ فِي شهر أكثر منه صياما في شعبان. (الصحيح لمسلم ،باب صيام النبي صلى الله عليه وسلم في غير رمضان، واستحباب أن لا يخلى شهرا عن صوم، 2/ 810)

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رمضان کے علاوہ کسی مہینے کے پورے روزے رکھتے نہیں دیکھا، اور شعبان کے علاوہ کسی مہینے میں اتنے زیادہ روزے رکھتے نہیں دیکھا۔

یہ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ شعبان محض ایک تقویمی مہینہ نہیں بلکہ رمضان کی دہلیز ہے، جہاں ٹھہر کر بندہ اپنے نفس کو نظم و ضبط سکھاتا ہے، بھوک کے ذریعے دل کو نرم کرتا ہے، اور عبادت کے ذوق کو بیدار کرتا ہے، تاکہ رمضان اچانک بوجھ بن کر نہ آئے بلکہ ایک مانوس مہمان کی طرح آئے اور خوشی خوشی اس کا استقبال کیا جائے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے سوال پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب دراصل پورے ماہ شعبان کی تفسیر ہے۔

"يَا رَسُولَ الله ، إِنَّكَ تَصُومُ حَتَّى لاَ تَكَادَ تُفْطِرُ ، وَتُفْطِرُ حَتَّى لاَ تَكَادَ أَنْ تَصُومَ إِلاَّ يَوْمَيْنِ إِذَا دَخَلاَ فِي صِيَامِكَ وَإِلاَّ صُمْتَهُمَا ، قَالَ : أَيُّ يَوْمَيْنِ ؟ قُلْتُ : يَوْمَ الِاثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيسِ ، قَالَ : ذَانِكَ يَوْمَانِ تُعْرَضُ فِيهِمَا الأَعْمَالُ عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ، وَأُحِبُّ أَنْ يُعْرَضَ عَمَلِي وَأَنَا صَائِمٌ." (سنن نسائی:177/3)

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں دیکھتا ہوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی اتنے زیادہ روزے رکھتے ہیں کہ گویا افطار ہی نہیں کرتے، اور کبھی اتنا افطار فرماتے ہیں کہ گویا صرف دو دن ہی روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: وہ کون سے دو دن ہیں؟ حضرت اسامہ نے جواباً عرض کی: پیر اور جمعرات۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ دو دن ہیں جن میں اعمال ربّ العالمین کے حضور پیش کیے جاتے ہیں، اور مجھے یہ پسند ہے کہ میرا عمل اس حال میں پیش ہو کہ میں روزے سے ہوں۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ مزید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں آپ کو کسی اور مہینے میں اتنے روزے رکھتے نہیں دیکھتا جتنے شعبان میں رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" ذَاكَ شَهْرٌ يَغْفُلُ النَّاسُ عَنْهُ بَيْنَ رَجَبٍ وَرَمَضَانَ، وَهُوَ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيهِ الْأَعْمَالُ إِلَى رَبِّ

الْعَالَمِينَ." (مسند احمد :85/36)

یہ وہ مہینہ ہے جس سے لوگ غافل ہو جاتے ہیں، کیوں کہ یہ رجب اور رمضان کے درمیان واقع ہے، اور اسی مہینے اعمال رب العالمین کے حضور پیش کیے جاتے ہیں، اس لیے مجھے پسند ہے کہ میرا عمل اس حال میں پیش ہو کہ میں روزے سے ہوں۔ یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ عمل زیادہ محبوب ہے جو غفلت کے شور میں تنہائی سے اٹھے، جو نمائش سے پاک ہو، اور جو نفس پر گراں گزرنے کے باوجود اخلاص کے ساتھ انجام دیا جائے۔

اسی مضمون کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی بیان فرمایا۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کبھی اتنے روزے رکھتے کہ ہم کہتے اب افطار ہی نہیں کریں گے، اور کبھی اتنا افطار فرماتے کہ ہم کہتے اب روزہ رکھیں گے ہی نہیں۔ اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو رمضان کے سوا کبھی کسی مہینے کے پورے روزے رکھتے نہیں دیکھا، اور میں نے آپ ﷺ کو شعبان کے علاوہ کسی مہینے میں اتنے زیادہ روزے رکھتے نہیں دیکھا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ شعبان کے پورے روزے رکھتے تھے، اور مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ شعبان میں روزے رکھتے تھے، مگر تھوڑے دن چھوڑ بھی دیتے تھے۔

اسی حقیقت کو امام ابن رجب نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ غفلت کے اوقات کو عبادت سے آباد کرنا اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ؛ فتنوں، انتشار اور افراتفری کے زمانے میں عبادت کرنا میری طرف ہجرت کرنے کے برابر ہے۔ امام نووی رحمہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے وقت میں اکثر لوگ عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں، اس لیے جو بندہ اس ہجوم میں اللہ کو یاد رکھتا ہے وہ خصوصی فضل کا مستحق ہوتا ہے۔

علما نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اعمال کے پیش کیے جانے کے اوقات مختلف ہیں۔ دن اور رات کے اعمال روزانہ، ہفتے کے اعمال پیر اور جمعرات کو، اور پورے سال کے اعمال ماہِ شعبان میں اللہ کے حضور پیش کیے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہماری سال بھر کی کارگزاریاں ماہِ شعبان میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کی جاتی ہیں تو ایسے میں ایمان اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس مہینے میں اپنے باطن کو سنوارے، توبہ کو تازہ کرے، اور اطاعت کی حالت میں اللہ کے سامنے حاضر ہو۔

نصف شعبان کی رات کے حوالے سے بھی اصل توجہ رسموں اور ظاہری اہتمام پر نہیں بلکہ دل کی صفائی پر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات اپنی مخلوق پر رحمت و غفران کی نظر فرماتا ہے اور سب کو بخش دیتا ہے، سوائے مشرک اور کینہ رکھنے والے کے۔

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ اس رات کی سب سے بڑی رکاوٹ دل کا میل ہے۔ حسد، بغض، کینہ اور عداوت وہ زنگ ہیں جو عبادت کے نور کو بھی بے اثر کر دیتے ہیں۔ اگر اس رات کچھ کرنا ہے تو دل کو صاف کرنا ہے، رشتوں کو جوڑنا ہے، معاف کرنا ہے، اور اللہ کے حضور ٹوٹ کر جھک جانا ہے۔

ماہِ شعبان دراصل ایک خاموش پیغام ہے — رمضان آنے والا ہے۔ یہ مہینہ ہمیں بتاتا ہے کہ جو شخص تیاری کے بغیر رمضان میں داخل ہوا، وہ اکثر رسموں میں الجھ کر روح سے محروم رہ گیا۔ اور جو شعبان میں سنبھل گیا، اس کے لیے رمضان رحمت، نور اور نجات بن جاتا ہے۔

ماہِ شعبان ہماری زندگی کے قیمتی اوقات میں شمار ہوتا ہے ہیں، یہ ایک ایسی مہلت ہے جو اگلے برس ہمیں ملے گی یا نہیں یہ نہیں

کہا جاسکتا، لہٰذا لازم ہے کہ ہم اسی کو غنیمت جانیں، روزے، قیامِ شب، تلاوتِ قرآن اور آپس کی اصلاح کے ذریعے اسے آباد کریں۔ اس مہینے کو اپنے ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ بنائیں، اور اس بات پر غور کریں کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے مواقع کو کس طرح سمیٹا۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج تم میں سے کون روزے سے ہے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں۔ پھر فرمایا: آج تم میں سے کس نے جنازے کے ساتھ شرکت کی؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: میں۔ پھر فرمایا: آج تم میں سے کس نے کسی مسکین کو کھانا کھلایا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں۔ پھر فرمایا: آج تم میں سے کس نے کسی مریض کی عیادت کی؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سب خوبیاں جس شخص میں ایک دن جمع ہو جائیں، وہ ضرور جنت میں داخل ہو گا۔

ہمارے اسلافِ صالحین ماہِ شعبان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ وہ اسے قرآنِ کریم کی کثرتِ تلاوت سے آباد کرتے تھے۔ سلمہ بن کہیل کہتے ہیں کہ شعبان کو قرّاء کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ حبیب بن ابی ثابت فرماتے ہیں یہ قرآن پڑھنے والوں کا مہینہ ہے۔ جب ماہِ شعبان آتا تو عمرو بن قیس الملائی اپنی دکان بند کر دیتے اور پوری طرح قرآن کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔

آج لوگ خون بہانے، مال لوٹنے، ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے، فتنوں کی آگ بھڑکانے اور امت کو پارہ پارہ کرنے میں مشغول ہیں، تاکہ اس کی قوت ختم ہو جائے، اس کے نوجوان ضائع ہو جائیں اور اس کی بنیادیں ہلا دی جائیں، اور دشمن مضبوط ہو۔ ایسے حالات میں ہم پر لازم ہے کہ ہم اس عظیم اور بابرکت مہینے میں طاعت و عبادت کی طرف متوجہ ہو جائیں، روزوں، قیام، تلاوتِ قرآن اور حتی المقدور لوگوں کی اصلاح کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔

گذشتہ سطور سے معلوم ہوا کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں اعمال اللہ ربّ العالمین کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم ایسے نیک اعمال کی طرف راغب ہوں جو قیامت کے دن خوشی و خرّمی کا باعث بنیں، جو چہروں کو روشن اور تاب ناک کریں اور ہمارے آقا و مولا جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی و رضا حاصل کریں۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جن کے اعمال اس مہینے اللہ کے حضور پیش کیے گئے اور وہ اعمال چہرے سیاہ کرنے والے نکلے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غمگین کیا۔

آج دنیا بھر میں گناہوں اور برائیوں کا غلبہ ہو چکا ہے، شر پسندوں کا شر ہر جگہ پھیل گیا ہے، لوگ گم راہی کی دلدل میں گردن تک دھنسے ہوئے ہیں! کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو "کل" کی امید پر اپنے "آج" کو لایعنی خرچ کیے جا رہے ہیں مگر افسوس کہ ان کو "کل" میسر ہی نہیں ہوتا، وہ آنے والے دنوں کا استقبال تو ضرور کرتے ہیں مگر افسوس دن پورا نہیں کر پاتے۔ یاد رکھیے ہماری ہر سانس ایک مہلت ہے، ایسی مہلت جو دوبارہ اس دنیا میں حاصل نہیں ہونے والی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب جان کر بھی ہم ماہِ شعبان کو طاعت و عبادت میں اور گناہوں کو چھوڑنے میں استعمال نہیں کر سکتے...؟ سوال ہے کہ کیا ہم موت سے پہلے زندگی کے موقع کو غنیمت جان سکتے ہیں؟ کیا ہم وقت کی نعمت کو پہچان کر اسے لہو و لعب اور معصیت و گناہ میں ضائع ہونے سے بچا سکتے ہیں؟ یہ کوئی جبر کا سودا نہیں ہے، دینے والا تو دینے پر آمادہ لینے والا چاہیے۔

دعا ہے، پروردگارِ عالم ہمیں موت کی سختیوں کے وقت ان لوگوں میں شامل نہ کرنا جو یہ کہیں:

﴿رَبِّ ارْجِعُونِ ○ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ﴾

اے میرے رب! مجھے واپس لوٹا دے، شاید میں وہ نیک عمل کر لوں جو میں چھوڑ آیا تھا۔ ■■■

تفہیم قرآن | آخری قسط

چاند اور سورج کا ایک حساب ہے

محمد حبیب اللہ بیگ ازہری

چاند اور سورج کی دوری:

زمین پر زندگی کے لیے چاند اور سورج کا وجود ضروری ہے، اور چاند اور سورج کی بقا کے لیے ان میں باہمی دوری ضروری ہے، کیوں کہ چاند اور سورج اگر ایک دوسرے سے قریب ہوگئے تو آپس میں ٹکرا کر تباہ و برباد ہو جائیں گے، اور اگر یہ دونوں دور ہوگئے تو سورج کی روشنی چاند پر اور وہاں سے زمین پر منعکس نہیں ہو پائے گی، اسی لیے پروردگار عالم نے انھیں ایک مناسب فاصلے پر رکھا، اور فرمایا:

لَا ٱلشَّمۡسُ يَنۢبَغِي لَهَآ أَن تُدۡرِكَ ٱلۡقَمَرَ وَلَا ٱلَّيۡلُ سَابِقُ ٱلنَّهَارِۚ وَكُلّٞ فِي فَلَكٖ يَسۡبَحُونَ ○ [سورۃ یٰسٓ 40]

یعنی نہ سورج چاند کو پا سکتا ہے، اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے، اور سارے فلکی اجرام اپنے اپنے مدار میں گردش رہے ہیں۔

یہ ہے خلاق اکبر کا بنایا ہوا وہ خوبصورت نظام جس کے تحت سارے ستارے گردش کر رہے ہیں، اور خاموش زبان میں دنیا کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ:

وَمِنۡ ءَايَٰتِهِ ٱلَّيۡلُ وَٱلنَّهَارُ وَٱلشَّمۡسُ وَٱلۡقَمَرُۚ لَا تَسۡجُدُواْ لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ وَٱسۡجُدُواْ لِلَّهِ ٱلَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمۡ إِيَّاهُ تَعۡبُدُونَ ○ [فصلت:37]

دن، رات اور چاند، سورج اللہ کی نشانیاں ہیں، تو چاند اور سورج کو سجدہ مت کرو، اگر تمھارے اندر شعور بندگی ہے تو سجدہ اللہ کو کرو جس نے انھیں پیدا کیا۔ بلا شبہ مستحق عبادت وہی ہے۔

فَتَبَارَكَ ٱللَّهُ أَحۡسَنُ ٱلۡخَٰلِقِينَ ○

قدرت کی دو عظیم نشانیاں- چاند اور سورج گہن:

جب ہم آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں چاند، سورج اور ستارے نظر آتے ہیں، ستارے چھوٹے ہوتے ہیں، دور ہوتے ہیں اور کثیر تعداد میں ہوتے ہیں، اسی لیے ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے ہم بے خبر ہوتے ہیں، جب کہ ان کے بالمقابل چاند اور سورج ہم سے قریب ہوتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں، اور ہم انھی کو دیکھ کر اپنی صبح و شام کا تعین کرتے ہیں، دن رات کا اندازہ لگاتے ہیں، اور ماہ و سال کا حساب رکھتے ہیں، اسی لیے ہمیں چاند سورج سے متعلق امور کو جاننے سے خاصی دلچسپی ہوتی ہے، تو آئیے ہم اپنے چاند اور سورج سے متعلق ایک اہم انقلاب کا تذکرہ کرتے ہیں، جسے عرف عام میں چاند گہن اور سورج گہن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سورج گہن اور چاند گہن:

چاند اور سورج ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں، اور ایک دوسرے کی مخالف سمت میں گردش کرتے ہیں، چاند ہمیشہ مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتا ہے، جب کہ سورج مشرق سے مغرب طرف حرکت کرتا ہے، اسی سفر کے دوران کبھی ایسا بھی ہوتا ہے چاند، سورج اور زمین ایک سیدھ میں آجاتے ہیں، اور درمیانی سیارہ سورج کی روشنی کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے، جس کے باعث چاند یا سورج گہری تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں، اسی کو اہل زمین چاند گہن یا سورج گہن سے تعبیر کرتے ہیں۔

چاند گہن:

جب چاند، سورج اور زمین ایک سیدھ میں جمع ہو جاتے

ہیں، اور چاند اور سورج کے درمیان زمین حائل ہوجاتی ہے تو سورج کی ساری شعائیں زمین پر مرکوز ہوجاتی ہیں، اور زمین کا سایہ براہ راست چاند پر پڑتا ہے، جس کے سبب چمکتا دمکتا چاند تاریک ہوجاتا ہے، اور زمین سے دیکھنے والوں کو سیاہ نظر آتا ہے، اسی کو چاند گہن کہتے ہیں۔

ماہرین فلکیات کے مطابق سال میں کم از کم ایک بار اور زیادہ سے زیادہ چار بار چاند کو گرہن لگ سکتا ہے، موسم اور وقت کے لحاظ سے اس کا دورانیہ بدلتا رہتا ہے، یہ عموماً ایک گھنٹہ چالیس منٹ کا ہوتا ہے، کیوں کہ چاند اپنے گرہن کے دوران فی سیکنڈ تقریباً ایک کیلو میٹر کی رفتار سے حرکت کرتا ہے، اس لیے چاند کو زمین کے سائے کے حدود سے باہر نکلتے نکلتے اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے، مزید یہ کہ کبھی چاند کی پوری سطح گہن آلود ہوجاتی ہے، ایسی صورت میں چاند بالکل سیاہ دکھائی دیتا ہے، اور کبھی چاند کا کوئی ایک گوشہ گہن آلود ہوتا ہے، باقی حصہ زمین کے سائے کے دائرے سے باہر رہتا ہے، ایسی صورت میں چاند سرخ نظر آتا ہے، چاند گرہن کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چاند اور سورج کے درمیان زمین حائل ہوجاتی ہے، جس کے سبب زمین پر رہنے والوں کو چاند روشن نظر نہیں آتا، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چاند گرہن کے وقت اگر کوئی چاند کی سطح سے سورج کو دیکھے تو چاند و سورج کے درمیان زمین حائل ہوجانے کی وجہ سے سورج گرہن نظر آئے گا۔

سورج گہن:

جب چاند، سورج اور زمین ایک سیدھ میں جمع ہو جاتے ہیں، سورج اور زمین کے درمیان چاند حائل ہوجاتا ہے تو چاند کے پیچھے سورج کی شعاعیں مجوب ہوجاتی ہیں، اور سورج سیاہ نظر آنے لگتا ہے، اسی کو عرف عام میں سورج گہن کہتے ہیں۔

واضح رہے کہ چاند، زمین کے تقریباً ایک چوتھائی حصہ کے برابر ہے، اور سورج زمین سے ایک سو نو گنا بڑا ہے، اس طرح سورج، چاند سے کم و بیش چار سو گنا بڑا ہے، ظاہر سی بات ہے کہ سورج سے چار سو گنا چھوٹا سیارہ سورج کی کرنوں کو بآسانی مجوب نہیں کر سکتا، اسی لیے سورج گرہن کی مختلف شکلیں بن جاتی ہیں۔

کبھی چاند، سورج سے اتنی مناسب دوری پر ہوتا ہے کہ چھوٹا سا چاند پورے سورج کو چھپالیتا ہے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے، اسے کسوف کلی یا مکمل گرہن کہتے ہیں، کبھی کسی چاند، سورج کے ایک گوشے کو چھپاتا ہے، اسے کسوف جزئی یا ناقص گہن کہتے ہیں، اور کبھی چاند، سورج کے درمیانی حصے کو چھپالیتا ہے، اور کنارے حسب سابق روشن رہ جاتے ہیں، اسے کسوف حلقی یا دائری گہن کہتے ہیں۔

سورج گہن کا دورانیہ بہت طویل نہیں ہوتا، کامل گرہن تو نادر ہے، البتہ سال میں دو تین دفعہ ناقص اور دائری گہن لگتا ہے، ناقص گہن عموماً سات منٹ اڑتالیس سیکنڈ کا ہوتا ہے، جب کہ دائری گہن بارہ منٹ چوبیس سیکنڈ کا ہوتا ہے، پھر سورج مغرب کی طرف اور چاند مشرق کی طرف روانہ ہوجاتا ہے، اور سورج گہن ختم ہوجاتا ہے۔

چاند گہن اور سورج گرہن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ الله، لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ، وَلَا لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُ فَاذكروا الله۔(أخرجه البخاری)

چاند اور سورج اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی ولادت یا موت کی وجہ سے چاند اور سورج کو گہن نہیں لگتا، لہذا جب تم گہن دیکھو تو اللہ کا ذکر کرو۔

نوٹ: اس مقالے کے لیے میں نے ڈاکٹر زغلول نجار صاحب قبلہ کی تفسیر الآیات الکونیۃ اور ڈاکٹر عبد الدائم الکحیل صاحب قبلہ کی موسوعۃ الکحیل سے استفادہ کیا ہے۔ فجزاهما الله خير الجزاء.

■■■

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

آپ کے مسائل

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین سوال آپ بھی کر سکتے ہیں

مفتی محمد نظام الدین رضوی

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حیات حقیقی دنیوی کے ساتھ بے شائبہ مجاز زندہ ہیں

سوال: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آج بھی حیات ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟

الجواب الملفوظ: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندہ ہیں اور حقیقی دنیوی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ

ترجمہ: ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔

اللہ کا یہ وعدہ پورا ہونے کے لیے ایک آن کے لیے جو ایک سیکنڈ سے کم ہوتا ہے، موت آئی تھی تاکہ اللہ کا یہ وعدہ سچ ہو جائے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے زندہ فرما دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی ازواج سے کوئی نکاح نہیں کر سکتا؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ شوہر زندہ ہو تو اس کی بیوی کے ساتھ کسی کا نکاح حلال نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو بھی مال چھوڑا وہ ترکہ نہیں ہے کہ وارثوں میں تقسیم ہو، اس کا درجہ ترکہ کا نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۝

ترجمہ: اور تمھیں نہیں پہنچتا کہ رسول اللہ کو ایذا دو اور نہ یہ کہ ان کے بعد کبھی ان کی بیبیوں سے نکاح کرو، بے شک یہ اللہ کے نزدیک بڑی سخت بات ہے۔ (کنزالایمان)

صحیح بخاری شریف میں ہے:

عن عائشة، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا نورث، ماتركناه صدقة. (صحيح البخاري، ج:2، ص:996، كتاب الفرائض/باب قول النبيﷺ: لا نُوْرَثُ، ماتركناه صدقة، مجلس البركات، مبارک فور)

ترجمہ: حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم انبیا کا کوئی وارث نہیں ہوتا، اور جو مال ہمارے بعد رہ جائے وہ صدقہ ہے۔

صحیح مسلم شریف میں ہے:

عن أبي هريرة، قال : قال رسول الله ﷺ: «لقد رأيتني في الحِجر. وقريش تسألني عن مسراي. فسألتني عن أشياء من بيت المقدس لم أثبتها. فكربت كربة ما كربت مثله قط. قال فرفعه الله لي أنظر إليه. ما يسألوني عن شيء إلا أنبأتهم به. وقد رأيتني في جماعة من الأنبياء. فإذا موسى قائم يصلي. فإذا رجل ضرب جعد كأنه من رجال شنوءة. وإذا عيسى بن مريم عليه السلام قائم يصلي. أقرب الناس به شبها عروة بن مسعود الثقفي. وإذا إبراهيم عليه السلام قائم يصلي. أشبه الناس به صاحبكم (يعني نفسه)

فحانت الصلاة فأممتهم. فلما فرغت من الصلاة قال قائل: يا محمد! هذا مالك صاحب النار فسلم عليه. فالتفت إليه فبدأني بالسلام». (الصحيح لمسلم، ج:1، ص:96، كتاب الإيمان/ باب الإسراء برسول الله ﷺ إلى السمٰوٰت، مجلس البركات، مبارک فور)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں حطیم کعبہ میں تھا، قریش مجھ سے میرے رات کے سفر کے بارے میں سوال کر رہے تھے، انھوں نے مجھ سے بیت المقدس کی کچھ چیزوں کے بارے میں پوچھا جنھیں میں نے محفوظ نہیں رکھا تھا، میں اس قدر شدید پریشانی میں مبتلا ہوا کہ کبھی اتنا پریشان نہ ہوا تھا، آپ نے فرمایا: اس پر اللہ تعالیٰ نے اس (بیت المقدس) کو اٹھا کر میرے سامنے کر دیا، میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ مجھ سے جس چیز کے بارے میں بھی پوچھتے، میں انھیں بتا دیتا۔ اور میں نے خود کو انبیا کی ایک جماعت میں دیکھا تو وہاں موسیٰ علیہ السلام تھے، جو کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے، وہ گٹھے ہوئے پھرتیلے بدن کے، گھنے بالوں والے شخص تھے، جیسے قبیلہ شنوءہ کے آدمیوں میں سے ایک ہوں۔ اور عیسیٰ ابن مریم کو دیکھا، وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، لوگوں میں سب سے زیادہ ان کے مشابہ عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام بھی کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، لوگوں میں سب سے زیادہ ان کے مشابہ تمھارے صاحب ہیں، آپ نے اپنی ذات مراد لی، پھر نماز کا وقت ہو گیا تو میں نے ان سب کی امامت کی۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو ایک کہنے والے نے کہا: اے محمد! یہ مالک ہیں، جہنم کے داروغہ، انھیں سلام کہیے، میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو انھوں نے پہل کر کے مجھے سلام کیا۔

سنن ابن ماجہ میں ہے:

عن أبي الدرداء، قال: قال رسول الله ﷺ: أكثروا الصلاة علي يوم الجمعة، فإنه مشهود تشهده الملائكة، وإن أحدا لن يصلي علي إلا عرضت علي صلاته حتى يفرغ منها» قال: قلت: وبعد الموت؟ قال: «وبعد الموت، إن الله حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء، فنبي الله حي يرزق.

(سنن ابن ماجہ، ج:2، ص:555، أبواب الجنائز/باب ذكر وفاته ودفنه ﷺ، دار الرسالة العالمية، دمشق)

ترجمہ: حضرت ابودردا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو؛ کیوں کہ یہ حاضری کا دن ہے، اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں، جب کوئی شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے تو اس کے فارغ ہونے تک اس کا درود میرے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔ حضرت ابودردا رضی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا: (یارسول اللہ) اور آپ کے وصال کے بعد بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! وفات کے بعد بھی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے لیے انبیاے کرام کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کا نبی زندہ ہوتا ہے اور اسے رزق بھی عطا کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے اپنے الفاظ میں اسی کی ترجمانی فرمائی ہے:

انبیا کو بھی اجل آنی ہے
مگر ایسی کہ فقط آنی ہے
پھر اسی آن کے بعد ان کی حیات
مثل سابق وہی جسمانی ہے
روح تو سب کی ہے زندہ ان کا
جسمِ پر نور بھی روحانی ہے
اوروں کی روح ہو کتنی ہی لطیف
ان کے اجسام کی کب ثانی ہے
پاؤں جس خاک پہ رکھ دیں وہ بھی
روح ہے پاک ہے نورانی ہے
اس کی ازواج کو جائز ہے نکاح
اس کا ترکہ بٹے جو فانی ہے
یہ ہیں حی ابدی ان کو رضاؔ
صدق وعدہ کی قضا مانی ہے

واللہ تعالیٰ أعلم..■■■

گفتگو

نمونۂ اسلاف

حضور مفکرِ اسلام حفظہ اللہ کی علمی و دعوتی خدمات کا تعارفی خاکہ

محمد نظام الدین المصباحی

19 جولائی 2025ء کو بولٹن، برطانیہ (UK) میں مفکرِ اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی کی پچاس سالہ دینی، علمی اور فکری خدمات کے اعتراف میں ایک عظیم الشان اور پروقار تقریب منعقد ہوئی، جس کا مقصد نہ صرف ایک عہد ساز شخصیت کی علمی و فکری کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا تھا بلکہ برصغیر سے لے کر یورپ و امریکہ تک پھیلے ہوئے دینی و فکری رشتوں کو بھی تازگی بخشنا تھا۔

اس تقریب میں عالمِ اسلام کی ممتاز اور جید علمی شخصیات نے شرکت فرما کر اس اجتماع کو وقار و اعتبار بخشا۔ ان معزز شرکا میں بالخصوص *علامہ قمر بستوی (امریکہ)، *علامہ شفیق الرحمن (ہالینڈ)، *علامہ شاکر نوری، *علامہ ایوب اشرفی، *علامہ اقبال احمد مصباحی، *علامہ ظفر محمود فراشوی، *علامہ ارشد مصباحی، اور علامہ فروغ قادری کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔ ان علماے کرام کی موجودگی نے اس تقریب کو بین الاقوامی علمی اجتماع کا رنگ عطا کیا۔

اسی پروگرام میں حضرت علامہ قمر الزماں اعظمی کی ہمہ جہت شخصیت پر مولانا نظام الدین مصباحی کا بصیرت افروز خطاب ہوا جو نہایت اہم اور فکری اعتبار سے وقیع تھا۔ یہ خطاب محض ایک تعارفی یا تاثراتی گفتگو بھر نہیں بلکہ حضرت مفکرِ اسلام کی علمی، فکری، دعوتی اور تنظیمی خدمات کا جامع، متوازن اور تحقیقی جائزہ ہے، جو عصرِ حاضر کے دینی مزاج اور فکری تقاضوں کو بھی پوری طرح سامنے رکھتا ہے۔

ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور میں اس خطاب کی اشاعت دراصل ایک ایسی علمی امانت کو محفوظ کرنے کی کوشش ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے فکری رہنمائی، علمی استفادہ اور تاریخی حوالہ بن سکتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئینِ اشرفیہ اس خطاب کو نہ صرف دلچسپی سے پڑھیں گے بلکہ اسے معاصر دینی فکر کو سمجھنے کی ایک معتبر دستاویز کے طور پر بھی قبول فرمائیں گے۔

(مہتاب پیامی)

الْحَمْدُ للهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ، أَمَّا بَعْدُ!

حضرات یہ پروگرام حضور مفکر اسلام حفظہ کی نصف صدی پر محیط خدمات دینیہ کے اعتراف میں منعقد ہے مخلوق کی طرف سے یہ اعتراف خدمات اللہ عزوجل کی بارگاہ میں قبولیت کی ایک علامت و نشانی ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ لِرَسُولِ الله صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَرَأَيْتَ الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْخَيْرَ وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ؟ وَفِي رِوَايَةٍ : يُحِبُّهُ النَّاسُ عَلَيْهِ، فَقَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ" ۔ (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة)

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ بندہ عمل اللہ عزوجل کے لیے

کرے اور پھر لوگوں میں مشہور ہو جائے اور لوگ اس سے محبت کریں، اس کی تعظیم و تکریم کریں اور یہ اس کو بطور شکر پسند آرہا ہو تو یہ نقد اجر ہے اور آخرت کا جو اجر ابھی باقی ہے وہ ادھار ہے۔ (مرقات)

ایک بار حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھ رہے تھے اپنے گھر میں کہ إِذْ دَخَلَ عَلَيَّ رَجُلٌ فَأَعْجَبَنِي الْحَالُ الَّتِي رَآنِي عَلَيْهَا .

تو حضور خاتم النبیین صلی الم نے فرمایا: اللہ عزوجل تم پر رحم کرے، اے ابوہریرہ! لك أَجْرَانِ: أَجْرُ السِّرِّ وَأَجْرُ الْعَلَانِيَةِ . الرَّجُلُ يَعْمَلُ الْعَمَلَ يَسُرُّهُ ، فَإِذَا أَطْلِعَ عَلَيْهِ أَعْجَبَهُ ذَلِكَ ، فَقَالَ رَسُولُ الله صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَهُ أَجْرَانِ: أَجْرُ السِّرِّ وَأَجْرُ الْعَلَانِيَةِ". (مرقات)

اب آپ کی شخصیت کا مختصر مگر جامع خاکہ سماعت کریں:

حضور مفکر اسلام حفظہ اللہ کو خدائے بزرگ و برتر نے بہت سی خوبیوں اور خصوصیتوں سے مالا مال فرمایا ہے۔ تدبر و تحمل، حلم و بردباری، عفو و درگزر، عجز و انکساری، جود و سخا، صبر و شکیب، احترام اکابر، شفقت اصاغر، جد و جہد، استقامت و ثبات قدمی، اصابت رائے، دور اندیشی وغیرہ خوبیاں آپ کی ذات بابرکات میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ نہایت متقی، پرہیز گار، ملت کا درد رکھنے والے، عالم باعمل ہیں۔ کئی علوم و فنون کے جامع ہیں، نحو و صرف، بلاغت و فصاحت، عربی و اردو ادب، منطق و فلسفہ، فقہ و تفسیر، حدیث و اصول حدیث، سیر و تاریخ، تصوف و روحانیت، شعر و سخن اور فن رجال میں ید طولی رکھتے ہیں۔ بہت سارے طالبان علوم نبویہ نے آپ سے اکتساب علم و فضل کیا۔ نان پارہ، روناہی اور مانچسٹر کے مدارس اس بات کے شاہد عدل ہیں۔

آپ ایک ماہر اور تجربہ کار خطیب کی حیثیت سے پورے عالم اسلام میں متعارف ہیں۔ آپ کے خطبات قرآن و احادیث، اقوال صوفیہ و فرامین ائمہ سے مبرہن و مدلل ہوتے ہیں۔ اپنے خطبات کے ذریعہ امت کے مسائل کا حل، فکر آخرت، دین داری وغیرہ کا درس دیتے ہیں۔ زبان و بیان نہایت شستہ اور سلیس ہوا کرتی ہے۔ جب آپ خطاب فرماتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان سے علم و حکمت کے جواہر پارے نکل رہے ہیں اور سامعین کے قلوب و اذہان کی تطہیر اور روح کی بالیدگی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ خطاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ آپ کے وعظ میں نصیحت و موعظت، امن و امان، اتحاد و اتفاق، اور صالح معاشرہ کی تشکیل کا عنصر وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔

آپ کی ذات میں مسلک اعلیٰ حضرت سے وفاداری اور دیگر مشائخ کے احترام کے ساتھ بالخصوص حضور مفتی اعظم ہند اور حضور حافظ ملت کی ذات سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ میری نگاہ میں آپ اس دور جدید میں نمونۂ اسلاف ہیں اور نوجوان علما کے لیے مشعل راہ ہیں۔

خطابت:

حضور مفکر اسلام کے خطاب میں الفاظ کا تسلسل، روانی اور انداز تفہیم نہایت عمدہ اور دل نشین ہوتا ہے؛ مثلاً ایک بار مسجد رضا، بلیک برن میں ارشاد فرمایا (عنوان تھا اولیاے کرام):

"کیا آپ حضرات بادشاہوں کا دن مناتے ہیں، ہارون الرشید، مامون، شاہ جہاں وغیرہم کا دن؟ نہیں! کیوں کہ بادشاہ تاریخ کے بطن سے جنم لیتا ہے اور پھر تاریخ کے اوراق میں گم ہو جاتا ہے، تاریخ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ مگر اللہ کا ولی دلوں میں زندہ رہتا ہے، روحوں میں زندہ رہتا ہے، ہمارے تصورات میں زندہ رہتا ہے، ہماری محافل میں زندہ رہتا ہے، زندگی میں بھی زندہ رہتا ہے اور مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
فرق اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے"

(اپنی یادداشت کے مطابق)

-*-*-*-

فکر امروز

عصری علوم اور علمائے ہند
وقت کی پکار اور قیادت کا نیا معیار

نبیل احمد غزالی

ماضی کا تسلسل اور حال کا المیہ:

اسلامی تاریخ کے اوراق پلٹیں تو ہمیں ایک شاندار روایت نظر آتی ہے جہاں مسجد و مکتب، دین و دنیا، اور عبادت گاہ و تجربہ گاہ کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں تھی۔ ہمارے اسلاف نے علم کو کبھی خانوں میں تقسیم نہیں کیا۔ ابن رشد بیک وقت ایک عظیم فقیہ بھی تھے اور اپنے وقت کے مایہ ناز طبیب اور فلسفی بھی۔ جابر بن حیان اور البیرونی صرف سائنس داں نہیں تھے بلکہ قرآن و سنت کے گہرے شناور بھی تھے۔

لیکن بدقسمتی سے گزشتہ چند صدیوں میں، خاص طور پر ہندوستان میں نوآبادیاتی دور کے بعد، علم کی تقسیم ''دینی'' اور ''دنیوی'' کے نام پر اس طرح ہوئی کہ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن کر کھڑے ہوگئے۔ آج کے ہندوستان میں، جہاں مسلمانوں کو بے پناہ سیاسی، سماجی اور معاشی چیلنجز کا سامنا ہے، اس خلیج کو پاٹنا محض ایک تعلیمی ضرورت نہیں بلکہ ''بقائے باہمی'' کا مسئلہ بن چکا ہے۔ یہ مقالہ اس بات کا احاطہ کرتا ہے کہ کس طرح مدارس اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا سنگم ایک ایسی قیادت کو جنم دے سکتا ہے جو ہندوستان کے آئینی ڈھانچے میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی بہترین رہنمائی کر سکے۔

ہندوستان کا موجودہ منظر نامہ اور علما کی ذمہ داری:

ہندوستان اس وقت ایک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ مسلمانوں کے مسائل اب صرف مسجد و مدرسہ کے تحفظ تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کا دائرہ کار آئینی حقوق، معیشت، میڈیا نیریٹو (Narrative) اور قانونی لڑائیوں تک پھیل چکا ہے۔

قیادت کا بحران:

ہمارے پاس جذباتی ہجوم تو ہے لیکن پالیسی سازوں (Policy Makers) کی کمی ہے۔ جب پارلیمنٹ میں کوئی بل پیش ہوتا ہے یا سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لا پر بحث ہوتی ہے، تو ہمیں ایسے افراد کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے جو "قال اللہ و قال الرسول" کے ساتھ ساتھ "انڈین پینل کوڈ (IPC) " اور آئین کی دفعات پر بھی ماہرانہ گرفت رکھتے ہوں۔

سسٹم میں شمولیت :

سسٹم سے باہر رہ کر صرف فریاد کرنے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ علما کا طبقہ، جو ملت کا سب سے ذہین اور باصلاحیت طبقہ ہے، اگر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بیوروکریسی، عدلیہ اور میڈیا میں جگہ نہیں بنائے گا، تو ہمارے فیصلے وہ لوگ کریں گے جو ہماری تہذیب و اقدار سے ناواقف ہیں۔

قانون اور عدلیہ-وقت کی اہم ترین ضرورت:

آج کے ہندوستان میں ''قانون'' ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے بغیر کوئی جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔ علما کے لیے قانون کی تعلیم حاصل کرنا "فرض کفایہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔

شریعت اور قانون کا امتزاج:

ہندوستان میں وکالت کے پیشے میں ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو عربی عبارات اور فقہی اصطلاحات کو بھی سمجھتے ہوں اور برطانوی قانون کی باریکیوں کو بھی۔ مثلاً وقف بورڈ کے

شعبۂ بزنس مینجمنٹ، نجم الدین اربکان یونیورسٹی، قونیہ، ترکی۔ nabilahmad078692@gmail.com

معاملات، وراثت کے مسائل، اور طلاق ثلاثہ جیسے موضوعات پر جب عدالتوں میں بحث ہوتی ہے، تو ایک عام وکیل اسلامی روح کو سمجھانے سے قاصر رہتا ہے۔ اگر ایک مفتی یا عالم خود "ایڈووکیٹ" یا "جج" کی کرسی پر ہو، تو وہ انصاف کے تقاضوں کو شریعت کی روشنی میں بہتر طور پر پورا کر سکتا ہے۔

پالیسی سازی میں کردار:

: قانون صرف عدالت تک محدود نہیں، بلکہ یہ پارلیمنٹ میں قانون سازی کا نام بھی ہے۔ علما جب قانون کے ماہر بن کر ایوانوں میں پہنچیں گے تو وہ ایسے قوانین بننے سے روک سکیں گے جو اسلامی اقدار سے متصادم ہوں۔

طب (Medical Science) انسانیت کی خدمت اور دعوت کا ذریعہ:

طب کا پیشہ ہمیشہ سے انبیا اور صلحا کی میراث رہا ہے۔

اخلاقیات کا بحران: آج کا میڈیکل سسٹم کمرشلائز ہو چکا ہے۔ ایسے میں اگر خوفِ خدا رکھنے والا عالم ڈاکٹر بنتا ہے، تو وہ مریض کو صرف "گاہک" نہیں سمجھے گا بلکہ انسانیت کی خدمت کرے گا۔

جدید فقہی مسائل: میڈیکل سائنس روزانہ نت نئے مسائل کھڑے کر رہی ہے (جیسے سروگیسی، جینیٹک انجینئرنگ، لائف سپورٹ سسٹم وغیرہ)۔ ایک مفتی جو صرف کتابوں میں مسائل پڑھتا ہے اور ایک عالم جو خود ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہو کر ان چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے، ان دونوں کے فتاویٰ میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ ڈاکٹر عالم زیادہ بصیرت کے ساتھ رہنمائی کر سکتا ہے۔

جنوبی ہند کا انقلابی ماڈل (کیرالہ کی مثال):

شمالی ہند کے مدارس کے برعکس، جنوبی ہند بالخصوص کیرالہ نے تعلیم کے میدان میں ایک خاموش انقلاب برپا کیا ہے۔ یہاں دو اداروں کا تذکرہ لازم ہے جنھوں نے "ملا اور مسٹر" کی تفریق کو عملی طور پر ختم کر دیا ہے۔

مرکز (Markaz) جامعہ الثقافۃ السنیہ:

شیخ ابوبکر احمد (کانتھا پورم) کا قائم کردہ یہ ادارہ صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ ایک مکمل "یونیورسٹی ٹاؤن" ہے۔

ان کا نظریہ یہ ہے کہ ایک طالب علم حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ اسکول کی تعلیم شروع کرے۔ جب وہ بالغ ہو تو اس کے پاس عالم کی سند بھی ہو کوئی کسی پروفیشنل ڈگری (جیسے انجینئرنگ یا بزنس مینجمنٹ) بھی۔

انھوں نے کالی کٹ میں ایک "نالج سٹی" بسائی ہے جہاں لا کالج، یونانی میڈیکل کالج، اور انجینئرنگ کالج موجود ہیں، اور یہ سب دینی ماحول میں چل رہے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہونے والا نوجوان مسجد میں خطبہ بھی دیتا ہے اور ملٹی نیشنل کمپنی میں پروجیکٹ بھی ہینڈل کرتا ہے۔

معدن اکیڈمی (Ma'din Academy):

سید ابراہیم الخلیل بخاری کی قیادت میں ملاپورم میں واقع یہ ادارہ "جدیدیت اور روایت" کا حسین سنگم ہے۔

وژن 20 (Vicennium):

معدن نے طویل مدتی منصوبہ بندی کے تحت ایسے کورسز متعارف کرائے جہاں علما کو ماس میڈیا، سائیکالوجی اور انٹرنیشنل ریلیشنز پڑھائے جاتے ہیں۔

اسپینش اور دیگر زبانیں:

یہاں کے علما کو صرف عربی اور انگریزی نہیں بلکہ ہسپانوی اور دیگر یورپی زبانیں سکھائی جاتی ہیں تاکہ وہ مغرب میں جا کر اسلام کی دعوت کا کام کر سکیں۔

معدن کے فارغین آج ہندوستان کی سپریم کورٹ میں وکالت کر رہے ہیں، بڑے ہسپتالوں کا انتظام سنبھال رہے ہیں، اور سول سروسز کے امتحانات پاس کر رہے ہیں۔

مدارس کے فضلا کے لیے کیریئر روڈ میپ (عملی خاکہ)

مدارس کے طلبہ اکثر ذہین ہونے کے باوجود رہنمائی (Career Counseling) نہ ہونے کی وجہ سے صرف تدریس تک محدود رہ جاتے ہیں۔ ذیل میں ایک چارٹ دیا جارہا ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ عالم بننے کے بعد (یا دوران) کون سے میدانوں میں قدم رکھا جاسکتا ہے:

شعبہ (Field)	درکار کورس/ڈگری	ممکنہ کیریئر/عہدہ	ملت کو فائدہ
قانون (Law)	BA-LLB (5 Years) یا LLB (3 Years)	جج، سرکاری وکیل، لیگل ایڈوائزر، کارپوریٹ لائر	مسلم پرسنل لا کا تحفظ، وقف املاک کی بازیابی، بے گناہوں کی قانونی مدد۔
انتظامیہ (Civil Services)	گریجویشن (کسی بھی مضمون میں) + UPSC کی تیاری	IAS کلکٹر، IPS پولیس کمشنر، IFS سفیر	پالیسی سازی میں شرکت، فسادات کی روک تھام، انتظامی امور میں نمائندگی۔
تعلیم و تحقیق (Academia)	BA, MA, PhD (UGC-NET)	یونیورسٹی پروفیسر، ریسرچ اسکالر، وائس چانسلر	نصاب کی تدوین، تاریخ اسلام کا صحیح رخ پیش کرنا، علمی سطح پر اسلام کا دفاع۔
میڈیا اور صحافت	ماس کمیونیکیشن (Mass Comm) / جرنلزم	ٹی وی اینکر، کالم نگار، ایڈیٹر، یوٹیوبر	اسلاموفوبیا کا مقابلہ، میڈیا ٹرائل کا جواب، صحیح حقائق کی ترسیل۔
طب (Medicine)	NEET اگر سائنس بیک گراؤنڈ ہو یا BUMS یونانی	ڈاکٹر (MBBS/BUMS)، سرجن، ہسپتال ایڈمنسٹریٹر	خدمت خلق، طبی اخلاقیات (Bio-ethics) میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت۔
مینجمنٹ (Management)	BBA, MBA	کمپنی منیجر، HR، انٹرپرینیور (تاجر)	حلال معیشت کا فروغ، اوقاف اور مدارس کا بہتر مالیاتی انتظام۔

خلاصہ یہ کہ علما کا عصری تعلیمی اداروں کا رخ کرنا وقت کی اہم ترین پکار ہے۔ ہمیں ایسے "جامع الکمالات" افراد کی ضرورت ہے جن کی پیشانی پر سجدے کا نشان ہو اور ہاتھ میں جدید ٹیکنالوجی۔ جو ممبر رسول ﷺ پر بیٹھ کر وعظ بھی کر سکیں اور اقوام متحدہ میں کھڑے ہو کر امت مسلمہ کا مقدمہ بھی لڑ سکیں۔

کیرالہ کے ماڈل نے ہمیں راستہ دکھادیا ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ علمی مراکز اس ماڈل کو اپنے ماحول کے مطابق ڈھالیں۔ جب ایک عالم جج کی کرسی پر، ڈاکٹر کے کلینک میں، اور ضلع مجسٹریٹ کے دفتر میں بیٹھا نظر آئے گا، تب مسلمانوں کے مسائل حل ہوں گے اور اسلام کا حقیقی نظام عدل و رحمت دنیا کے سامنے آئے گا۔ یہ سفر مشکل ضرور ہے، مگر ناممکن نہیں۔

☆☆☆

شعاعیں

حدیث موضوع سے متعلق افادات رضویہ

سید حدیر الحسن شاہ

طالبِ تحقیق ان چند حرفوں کو یاد رکھے کہ باوصف وِجازت محصل و ملخص علم کثیر ہے اور شاید اس تحریر نفیس کے ساتھ ان سطور کے غیر میں کم ہی ملیں۔

موضوع کی تعریف: اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان محدث بریلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ”(موضوع) وہ حدیث کہ جو نری (من) گھڑت اور افترا اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ بنائی گئی ہو۔“ (فتاویٰ رضویہ جلد5 صفحہ586)

نوٹ: اسے حدیث کہنا بطور مجاز ہے حقیقت میں یہ حدیث ہی نہیں۔ (نزہۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد1 صفحہ88)

موضوع کا حکم: حدیثِ موضوع بالاجماع ناقابل انجبار نہ فضائل وغیرہ کسی باب میں لائق اعتبار۔ (فتاویٰ رضویہ جلد5 صفحہ440)

مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”حدیث گھڑنا بھی گناہ اور دیدہ ودانستہ موضوع حدیث بیان کرنا بھی گناہ، بلکہ جس حدیث کے متعلق موضوع ہونے کا گمان غالب ہوا سے بھی بیان نہ کرے فقط موضوعیت کا وہم کافی نہیں، ہاں اس کی موضوعیت بتاکر ذکر کرنا جائز ہے تاکہ لوگ بچیں۔“

(مرآۃ المناجیح جلد1 کتاب العلم صفحہ183 مکتبہ قادری پبلشرز لاہور)

حکم وضع قطعی یا ظنی ؟ امام اہل سنت فرماتے ہیں:

”اس میں کلام نہیں کہ حکمِ وضع کبھی قطعی ہوتا ہے کبھی ظنی۔“

(فتاویٰ رضویہ جلد5 صفحہ587)

حدیث کے قرائن حالیہ کی بنیاد پر ہی حکم وضع کی قطعیت و ظنیت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ امام اہل سنت علیہ الرحمہ نے جو وضع کے پندرہ 15 قرائن وعلامات بیان فرمائے ہیں کما سیأتی ان میں سے پہلے دس 10 کی بنیاد پر حکم وضع قطعی اور آخری پانچ کی بنیاد پر ظنی طور پر کیا جاسکتا ہے۔ علامت وضع نمبر دس کے آخر کو ملاحظہ کیجیے۔

تعدد طرق اور موضوع روایت: امام اہلسنت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ان الموضوع لایصلح لشیئ اصلا ولا یلتئم جرحه ابدا ولوکثرت طرقه ماکثرت ، فان زیادة الشر لایزید الشیئ الا شرا ، وایضا الموضوع کالموضوع کالمعدوم والمعدوم لایقوی و لایتقوی .(فتاویٰ رضویہ جلد5 صفحہ543)

ترجمہ: موضوع حدیث کسی طرح کارآمد نہیں ہے اور کثرت طُرق کے باوجود اس کا عیب ختم نہیں ہوسکتا کیونکہ شر کی زیادتی سے شر مزید بڑھتا ہے، نیز موضوع، معدوم چیز کی طرح ہے اور معدوم چیز نہ قوی ہوسکتی ہے اور نہ قوی بنائی جاسکتی ہے۔

موضوع سے متعلقہ اقسام:

موضوع حکمی: جس کا مدار وضّاع کذاب یا متہم بالکذب پر ہو یہ (ضعیف کی) بدترین قسم ہے بلکہ بعض محاورات کے رُو سے مطلقاً اور ایک اصطلاح پر اس کی نوعِ اشد یعنی جس کا مدار کذب پر ہو عین موضوع یا نظر دقیق میں یوں کہیے کہ ان اطلاقات پر داخل موضوع حکمی ہے۔ (فتاویٰ رضویہ جلد5 صفحہ440)

عمل بموضوع: یعنی موضوع حدیث پر عمل کرنا یہ جائز نہیں۔

عمل بمافی الموضوع: یعنی موضوع روایت میں جو بات وارد ہے اگر وہ خلاف شرع نہیں تو محض مباح بات ہے اس پر عمل جائز ہے۔

امام اہل سنت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: عمل بموضوع وعمل بمافی الموضوع میں فرقِ عظیم ہے۔ (فتاویٰ رضویہ جلد5 صفحہ871)

جیسا کہ بیان کردہ ان کی تعریف سے واضح ہے۔

اہم وضاحت: موضوع حکمی امام ابن حجر و سیوطی رحمہ

اللہ کے نزدیک موضوع ہے اور فضائل میں نا قابل قبول جبکہ امام اہلسنت علیہ الرحمہ کے ہاں مقبول اگرچہ شدید ضعیف ہے مگر فضائل میں معتبر ہے۔(فتاویٰ رضویہ جلد5 صفحہ 534)

ثبوت وضع کے 15 طریقے: کسی روایت کی موضوعیت کیسے ثابت ہوگی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے اس کے ثبوت کے پندرہ طریقے بیان کیے جو درج ذیل ہیں:

موضوعیت یوں ثابت ہوتی ہے کہ اس روایت کا مضمون (1) قرآن عظیم (2) سنت متواترہ (3) یا اجماع قطعی قطعیات الدلالۃ (4) یا عقل صریح (5) یا حسّ صحیح (6) یا تاریخ یقینی کے ایسا مخالف ہو کہ احتمال تاویل و تطبیق نہ رہے۔(7) یا معنی شنیع و قبیح ہوں جن کا صدور حضور پر نور صلوات اللہ علیہ سے معقول نہ ہو، جیسے معاذ اللہ کسی فساد یا ظلم یا عبث یا سفہ یا مدح باطل یا ذم حق پر مشتمل ہونا۔(8) یا ایک جماعت جس کا عدد حد تواتر کو پہنچے اور ان میں احتمال، کذب یا ایک دوسرے کی تقلید کا نہ رہے اس کے کذب و بطلان پر گواہی مستند الی الحس دے۔(9) یا خبر کسی ایسے امر کی ہو کہ اگر واقع ہوتا تو اس کی نقل و خبر مشہور و مستفیض ہو جاتی، مگر اس روایت کے سوا اس کا کہیں پتہ نہیں۔(10) یا کسی حقیر فعل کی مدحت اور اس پر وعدہ و بشارت یا صغیر امر کی مذمت اور اس پر وعید و تھدید میں ایسے لمبے چوڑے مبالغے ہوں جنہیں کلام معجز نظام نبوت سے مشابہت نہ رہے۔(11) یا یوں حکم وضع کیا جاتا ہے کہ لفظ رکیک و سخیف ہوں جنہیں سمع دفع اور طبع منع کرے اور ناقل مدعی ہو کہ یہ بعینہا الفاظ کریمہ حضور افصح العرب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں یا وہ محل ہی نقل بالمعنیٰ کا نہ ہو۔(12) یا ناقل رافضی حضرات اہل بیت کرام علی سیدہم وعلیہم الصلاۃ والسلام کے فضائل میں وہ باتیں روایت کرے جو اُس کے غیر سے ثابت نہ ہوں، جیسے حدیث: لَحْمُكَ لَحْمِي وَدَمُكَ دَمِي. (تیرا گوشت میرا گوشت، تیرا خون میرا خون ت)

اقول: انصافا یوں ہی وہ مناقب امیر معاویہ و عمرو بن العاص کہ صرف نواصب کی روایت سے آئیں کہ جس طرح روافض نے فضائل امیر المومنین واہل بیت طاہرین میں قریب تین لاکھ حدیثیں وضع کیں " كَمَانَصَّ عَلَيْهِ الْحَافِظُ أَبُو يَعْلَى وَالْحَافِظُ الْخَلِيلِيُّ فِي الْإِرْشَادِ[جیسا کہ اس پر حافظ ابو یعلی اور حافظ خلیلی نے ارشاد میں تصریح کی ہے۔ یونہی نواصب نے مناقب امیر معاویہ میں حدیثیں گھڑیں كَمَا أَرْشَدَ إِلَيْهِ الْإِمَامُ الذَّابُّ عَنِ السُّنَّةِ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى (جیسا کہ اس کی طرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالی نے رہنمائی فرمائی جو سنت کا دفاع اور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔)

(13) یا قرائن حالیہ گواہی دے رہے ہوں کہ یہ روایت اس شخص نے کسی طمع سے یا غضب وغیرہما کے باعث ابھی گھڑ کر پیش کر دی ہے جیسے حدیث سبق میں زیادت جناح اور حدیث ذم معلّمین اطفال۔ (14) یا تمام کتب و تصانیف اسلامیہ میں استقرائے تام کیا جائے اور اس کا کہیں پتہ نہ چلے یہ صرف اجلہ حفاظ ائمہ شان کا کام تھا جس کی لیاقت صدہا سال سے معدوم۔ (15) یا راوی خود اقرار وضع کر دے خواہ صراحت خواہ ایسی بات کہے جو بمنزلہ اقرار ہو، مثلاً ایک شیخ سے بلاواسطہ بدعوی سماع روایت کرے، پھر اس کی تاریخ وفات وہ بتائے کہ اس کا اس سے سننا معقول نہ ہو یہ پندرہ باتیں ہیں کہ شاید اس جمع و تلخیص کے ساتھ ان سطور کے سوا نہ ملیں۔ وَلَوْ بَسَطْنَا الْمَقَالَ عَلَى كُلِّ صُورَةٍ لَطَالَ الْكَلَامُ وَتَقَاصَى الْمَرَامُ وَلَسْنَا هُنَالِكَ بِصَدَدِ ذلك. (اگر ہم ہر ایک صورت پر تفصیلی گفتگو کریں تو کلام طویل اور مقصد دور ہو جائے گا لہذا ہم یہاں اس کے درپے نہیں ہوتے)

ثمّ اقول (پھر میں کہتا ہوں۔ ت) رہا یہ کہ جو حدیث ان سب سے خالی ہو اس پر حکم وضع کی رخصت کس حال میں ہے، اس باب میں کلمات علمائے کرام تین طرز پر ہیں:

(1) انکار محقق یعنی بے امور مذکورہ کے اصلاً حکم وضع کی راہ نہیں اگرچہ راوی وضاع، کذاب ہی پر اُس کا مدار ہو، امام سخاوی نے فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث میں اسی پر جزم فرمایا۔

(2) کذاب وضاع جس سے عمداً نبی صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم پر معاذ اللہ بہتان وافترا کرنا ثابت ہو، صرف ایسے کی

حدیث کو موضوع کہیں گے وہ بھی بطریقِ ظن نہ بروجہ یقین کہ بڑا جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے اور اگر قصداً افترا اس سے ثابت نہیں تو اُس کی حدیث موضوع نہیں اگرچہ مہتم بکذب ووضع ہو، یہ مسلک امام الشان وغیرہ علما کا ہے۔

(3) بہت علما جہاں حدیث پر سے حکمِ وضع اٹھاتے ہیں وجہ رد میں کذب کے ساتھ تہمتِ کذب بھی شامل فرماتے ہیں کہ یہ کیونکر موضوع ہوسکتی ہے حالانکہ اس کا کوئی راوی نہ کذاب ہے نہ متہم بالکذب۔ کبھی فرماتے ہیں موضوع تو جب ہوتی کہ اس کا راوی متہم بالکذب ہوتا یہاں ایسا نہیں تو موضوع نہیں۔(فتاویٰ رضویہ جلد 5 صفحہ 460 تا 466)

آخر پر فرماتے ہیں: "بالجملہ اس قدر پر اجماعِ محققین ہے کہ حدیث جب اُن دلائل وقرائن قطعیہ وغالبہ سے خالی ہو اور اُس کا مدار کسی متہم بالکذب پر نہ ہو تو ہرگز کسی طرح اُسے موضوع کہنا ممکن نہیں جو بغیر اس کے حکم بالوضع کردے یا مشدد مفرط ہے یا مخطی غالط یا متعصب مغالط واللہ الھادی وعلیہ اعتمادی۔"(فتاویٰ رضویہ جلد 5 صفحہ 468)

حکم وضع اور منہج محدثین: ماقبل سطور بالا سے واضح ہوچکا کہ محدثین نے ثبوت کذب و وضع کے بہت سے طریقے اپنی تصنیفات میں بیان کیے ہیں اور محدثین کے ہاں حکم وضع کے تعلق سے مختلف شرائط ہیں اور بعض محدثین کی چند شرائط بعض سے الگ ہیں مثلاً امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کذاب کی روایت کو موضوع قرار دیتے ہیں اور امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ متہم بالکذب کی روایت کو بھی موضوع قرار دیتے ہیں اسی وجہ سے بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ کسی روایت کو ایک محدث موضوع کہتے ہیں اور دوسرے اسے ضعیف بیان کرتے ہیں۔

یاد رہے کسی ایک محدث کے کسی روایت کو موضوع کہہ دینے سے اس کا سب کے ہاں موضوع ہونا لازم نہیں آتا اور کسی ایک محدث کے روایت کو موضوع کہہ دینے پر آنکھ بند کرکے موضوع ہونے کا حکم قائم نہیں کیا جاسکتا لیکن اعلیٰ حضرت کی بیان کردہ علامت وضع انتہائی معتدل ومعتمد علیہ ہیں۔

تحقیق کرنے پر یہ بات محقق پر مخفی نہیں رہتی کہ امام اہلسنت علیہ الرحمہ کی بیان کردہ علامات وضع محدثین میں بالخصوص علامہ سخاوی رحمہ اللہ کی موافقت میں ہیں۔ بلکہ خود اعلیٰ حضرت امام سخاوی قدس سرہ کے منہج کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان الوضع لایثبت الابالقرائن المقررۃ ان تفرد بہ کذاب اووضاع کمانص علیہ فی ھذا الکتاب ، وھو عندی مذھب قوی اقرب الی الصواب."

ترجمہ: امام سخاوی کا خیال ہے کہ موضوع کی پہچان مقررہ قرائن ہی سے ہوتی ہے اگرچہ روایت کرنے والا کذّاب یا وضّاع اس روایت میں متفرد ہو، جیسا کہ امام سخاوی نے اس کتاب میں بیان کیا ہے میرے نزدیک یہی مؤقف قوی اور اقرب الی الصواب ہے۔(فتاویٰ رضویہ جلد 5 صفحہ 534)

مختصر افادات رضویہ: فتاویٰ رضویہ جلد پنجم (5) میں بیان کردہ فوائد ونکات درج ذیل ہیں:

◘ "حدیث کے صحیح نہ ہونے اور موضوع ہونے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اور حدیث کے صحیح نہ ہونے سے اسکا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔"(صفحہ 440,441) ◘ "ابن جوزی نے جس جس حدیث کو موضوع کہا اس کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔"(صفحہ 441) ◘ "لفظ لایثبت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ حدیث موضوع ہے"۔(صفحہ 442) ◘ "سند کا منقطع ہونا مستلزم وضع نہیں۔"(صفحہ 448) ◘ "ضُعف راویان کے باعث حدیث کو موضوع کہ دینا ظلم وجزاف ہے۔"(صفحہ 453) ◘ "منکر ومتروک کی حدیث بھی موضوع نہیں۔"(صفحہ 455,456) ◘ "کسی حدیث کی سند میں راوی کا مجہول ہونا اگر اثر کرتا ہے تو صرف اس قدر کہ اسے ضعیف کہا جائے نہ کہ باطل وموضوع۔"(صفحہ 443) ◘ "کتب موضوعات میں کسی حدیث کا ذکر مطلقاً ضعف ہی کو مستلزم نہیں۔"(صفحہ 548) ◘ "جس حدیث میں راوی مبہم وہ بھی موضوع نہیں۔"(صفحہ 451) ◘ "حدیث مضطرب بلکہ منکر بلکہ مدرج بھی موضوع نہیں"(صفحہ 456)۔ ◘ بارہا موضوع یا ضعیف کہنا صرف ایک سند کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ اصل حدیث کے اعتبار سے۔(صفحہ 468)

فاحفظ تحفظ وتحظی من الرشد باوفی حظ .

(اسے یاد رکھوگے تو محفوظ رہوگے اور ہدایت سے بھر پور حصہ پاؤگے)۔◘◘◘◘◘◘

حضرت نظام الدین اولیا کی حیات اور افکار

شمس آغاز

برصغیر کی روحانی تاریخ میں کچھ ایسی عظیم المرتبت شخصیات گزری ہیں جنہوں نے اپنے کردار، اخلاق، اور تعلیمات کے ذریعے انسانیت کے دلوں میں محبت، رواداری، اور اخوت کے چراغ روشن کیے۔ ان میں سب سے نمایاں نام حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کا ہے، جنھیں "محبوبِ الٰہی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نہ صرف چشتی سلسلہ کے ایک عظیم بزرگ تھے بلکہ برصغیر میں صوفیانہ فکر، اسلامی تعلیمات، انسانی مساوات، اور امن و محبت کے فروغ کے سب سے روشن میناروں میں سے ایک ہیں۔حضرت نظام الدین اولیاء کی تعلیمات محض مذہبی حدود تک محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے معاشرتی، اخلاقی، اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دائرۂ فکر میں شامل کیا۔ ان کی خانقاہ میں کسی مذہب، ذات یا طبقہ کی تفریق نہیں تھی۔ ہر آنے والا انسان ایک جیسا سمجھا جاتا، اور ہر کسی کے لیے محبت و احترام کا پیغام دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج سات سو سال گزر جانے کے باوجود دہلی میں واقع ان کا دربار آج بھی عقیدت، محبت اور روحانیت کا مرکز ہے۔

تعارف اور خاندانی پس منظر:

حضرت نظام الدین اولیاء کا اصل نام محمد بن احمد بن علی بدایونی تھا۔ آپ 1238ء (635ھ) میں بدایوں (اترپردیش) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان علمی اور دینی حیثیت سے ممتاز تھا۔ آپ کے والد حضرت سید عبداللہ بن احمد الحسینی بدایونی ایک نیک دل اور علم دوست شخصیت تھے، جنہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ آپ کی والدہ محترمہ بی بی زلیخا ایک عبادت گزار، متقی، اور صابر خاتون تھیں جنھوں نے آپ کی تربیت میں روحانی رنگ بھرا۔

بچپن ہی سے آپ کے اندر روحانی رجحان نمایاں تھا۔ دنیاوی لذتوں سے بے نیازی، عبادت سے شغف، اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کی عادت آپ میں کم عمری سے ہی پائی جاتی تھی۔ جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ کی والدہ نے بڑی صبر و استقامت سے آپ کی پرورش کی اور علم و معرفت کی راہ میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔

تعلیم و تربیت:

حضرت نظام الدین اولیاء نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی۔ قرآن مجید، فقہ، حدیث، اور تفسیر کے علاوہ آپ نے منطق و فلسفہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ بعد ازاں آپ دہلی تشریف لائے، جہاں آپ نے معروف علما سے اکتسابِ علم کیا۔ دہلی اس وقت علم و عرفان کا مرکز تھی، اور یہاں آنے سے آپ کے روحانی سفر نے نیا موڑ لیا۔ اسی دوران آپ کی ملاقات حضرت بابا فرید الدین گنجِ شکر سے ہوئی۔ آپ نے ان کے دستِ حق پر بیعت کی اور سلسلۂ چشتیہ میں شامل ہوئے۔ یہی وہ لمحہ تھا جس نے آپ کی زندگی کا رخ دنیا سے ہٹا کر تصوف و روحانیت کی راہ پر ڈال دیا۔

سلسلۂ چشتیہ اور آپ کا روحانی مقام:

حضرت نظام الدین اولیاء، سلسلۂ چشتیہ کے چوتھے بڑے پیشوا ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی (اجمیر شریف) سے شروع ہوا، پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکی، اس کے بعد حضرت فرید الدین گنج شکر، اور پھر حضرت نظام

9716518126،shamsaghazrs@gmail.com

الدین اولیاء تک پہنچا۔ چشتی سلسلہ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں محبت، خدمتِ خلق، اور انسان دوستی کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کے بزرگوں نے ہمیشہ حکمرانوں سے دوری اختیار کی، تاکہ ان کی خانقاہیں خالص روحانی مراکز رہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے بھی اسی روایت کو برقرار رکھا۔

تعلیمات کے بنیادی اصول:

1۔ محبت اور رواداری:

حضرت نظام الدین اولیاء کا سب سے نمایاں پیغام محبت تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ خدا کے نزدیک سب سے محبوب وہ شخص ہے جو خدا کی مخلوق سے محبت کرے۔ آپ نے مذہب، ذات، یا رنگ کی بنیاد پر کسی انسان کو کمتر نہیں سمجھا۔ آپ کی خانقاہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، غریب، امیر سب برابر سمجھے جاتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ محبت سب سے کرو، بغض کسی سے نہیں۔ یہی تعلیمات آگے چل کر حضرت امیر خسرو کے کلام میں جھلکتی نظر آتی ہیں، جنہوں نے اپنے مرشد کی فکر کو شاعری کے قالب میں ڈھالا۔

2۔ خدمتِ خلق:

آپ کا قولِ مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا سب سے آسان راستہ اس کی مخلوق کی خدمت ہے۔ آپ غریبوں، مسکینوں، یتیموں، اور بیواؤں کی مدد کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ آپ کی خانقاہ میں روزانہ سینکڑوں لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ مشہور ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر میرے پاس دو روٹیاں ہوں، تو ایک خود کھاؤں گا اور دوسری کسی بھوکے کو دوں گا۔ یہی طرزِ عمل بعد ازاں چشتیہ سلسلہ کی پہچان بن گیا۔ خدمتِ خلق، سادگی، اور عاجزی۔

3۔ دنیا سے بے رغبتی:

حضرت نظام الدین اولیاء دنیاوی جاہ و حشمت سے ہمیشہ دور رہے۔ آپ بادشاہوں کے دربار میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار سلطان علاؤالدین خلجی نے آپ کو دعوت دی، مگر آپ نے جانے سے انکار کر دیا۔ فرمایا کہ دو دروازے ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے؛ اگر دل میں خدا کا در ہے تو دنیا کے در کے لیے جگہ نہیں۔ یہی بے نیازی آپ کی روحانیت کا سب سے روشن پہلو تھا۔

4۔ توکل علی اللہ اور صبر:

آپ ہمیشہ توکل اور صبر کی تلقین فرماتے۔ فرماتے تھے کہ جو شخص اللہ پر بھروسا رکھتا ہے، وہ کبھی محروم نہیں ہوتا۔ آپ کی خانقاہ میں اکثر لوگ اپنی حاجتیں لے کر آتے، تو آپ انہیں دعا اور صبر کا مشورہ دیتے، اور اللہ پر یقین رکھنے کی تلقین فرماتے تھے۔

5۔ علم و معرفت:

آپ علم کو روحانیت کی بنیاد سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ علم وہ ہے جو دل کو منور کرے، نہ کہ وہ جو تکبر پیدا کرے۔ آپ کے نزدیک علم کا مقصد صرف معلومات حاصل کرنا نہیں بلکہ انسان کے باطن کو پاک کرنا اور اخلاق کو سنوارنا تھا۔

6۔ عاجزی و انکساری:

حضرت نظام الدین اولیاء کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ کسی کو بڑا یا چھوٹا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس دل میں تکبر ہے، وہ خدا کے نور کو نہیں پا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی مجلس میں آنے والا ہر شخص اپنے اندر سکون اور قربِ الٰہی کا احساس پاتا۔

7۔ ذکر و فکر اور عبادت:

آپ کی راتیں عبادت، ذکر، اور مناجات میں گزرتی تھیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ذکرِ الٰہی انسان کے دل کو زنگ سے پاک کرتا ہے۔ حضرت امیر خسرو لکھتے ہیں کہ میرے مرشد اکثر رات بھر عبادت میں مصروف رہتے، اور صبح فجر سے پہلے قرآن کی تلاوت کرتے۔

نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو کا روحانی تعلق:

حضرت امیر خسرو، حضرت نظام الدین اولیاء کے سب سے محبوب مریدوں میں سے تھے۔ ان دونوں کے درمیان محبت، عقیدت اور روحانی وابستگی کی ایسی مثال ملتی ہے جو تاریخِ تصوف

میں نایاب ہے۔اِن کی صحبت سے تصوف، شاعری، موسیقی اور روحانیت کا ایک ایسا حسین امتزاج پیدا ہوا جس نے برصغیر کی تہذیب، فن اور فکر پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالا۔یہی پاکیزہ صحبت قوالی کی ابتدا کا سبب بنی، جو آج دنیا بھر میں روحانی فن کے ایک منفرد انداز کے طور پر جانی جاتی ہے۔امیر خسرو نے اپنے مرشد کی محبت میں نہ صرف شاعری کی نئی جہتیں متعارف کروائیں بلکہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کو بھی نئی روح بخشی۔ان کے اشعار، جن میں عشقِ مرشد اور جذبِ الٰہی کی جھلک نمایاں ہے، آج بھی سننے والوں کے دلوں کو گرما دیتے ہیں۔حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں جو روحانی ماحول تھا، اُس نے امیر خسرو کی شخصیت اور فن دونوں کو نکھار دیا۔

حضرت نظام الدین اولیاء کا معاشرتی کردار:

آپ نے ایک ایسے وقت میں محبت، امن اور مساوات کا پیغام دیا جب معاشرہ ذات پات، طبقاتی امتیاز اور مذہبی اختلافات میں بٹا ہوا تھا۔آپ کی خانقاہ میں آنے والے ہر شخص کو عزت و احترام دیا جاتا تھا، چاہے وہ کسی بھی مذہب، ذات یا طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔آپ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کی پہچان اُس کے کردار سے ہے، نہ کہ اُس کے مذہب یا نسب سے۔یہی تعلیم بعد میں ہندوستانی تہذیب کا حصہ بن گئی۔ایک ایسی تہذیب جو محبت، رواداری اور باہمی احترام پر قائم ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء اور سیاسی حکمران:

اگرچہ آپ بادشاہوں کے دربار میں جانا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن آپ کے روحانی اثر سے کوئی بادشاہ خالی نہ رہا۔سلطان علاؤالدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ اور غیاث الدین تغلق ،سب آپ کی عظمت اور روحانی مقام کے معترف تھے۔یہ حکمران بارہا آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے خواہشمند رہے، مگر آپ نے دنیاوی جاہ وحشم سے ہمیشہ کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔آپ فرمایا کرتے تھے کہ فقیر کا مقام بادشاہوں کے دربار سے بلند ہے، کیونکہ وہ دلوں پر حکومت کرتا ہے۔آپ کی زندگی نے یہ ثابت کیا کہ حقیقی عظمت دنیاوی اقتدار میں نہیں، بلکہ دلوں پر حکمرانی میں ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ اور سماجی نظام:

آپ کی خانقاہ صرف عبادت کا مرکز نہیں تھی، بلکہ ایک مکمل سماجی اور روحانی نظام کا نمونہ تھی۔یہاں علم سکھایا جاتا، لنگر جاری رہتا، غریبوں کو کپڑے دیے جاتے اور محتاجوں کے علاج کا بندوبست بھی کیا جاتا۔آپ نے خانقاہ کو ایک روحانی یونیورسٹی کی صورت دی، جہاں محبت، اخلاق، خدمتِ خلق اور قربِ الٰہی کا درس دیا جاتا تھا۔یہاں نہ کوئی ذات دیکھی جاتی، نہ مذہب۔ہر شخص کو انسان ہونے کی بنیاد پر عزت ملتی۔آپ کی خانقاہ دراصل ایک ایسی سماجی پناہ گاہ تھی جہاں زخم خوردہ دلوں کو سکون، علم کے متلاشیوں کو رہنمائی، اور بھٹکے ہوؤں کو منزل ملا کرتی تھی۔

وفات اور مزارِ مبارک:

حضرت نظام الدین اولیاء نے 3 اپریل 1325ء (18 ربیع الثانی 725ھ) کو وصال فرمایا۔آپ کا مزار دہلی کے قلب میں واقع بستی نظام الدین میں ہے، جہاں ہر مذہب اور ملت سے تعلق رکھنے والے لوگ آج بھی عقیدت و احترام کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔یہ دربار صدیوں سے امن، محبت اور روحانیت کی خوشبو بکھیر رہا ہے، اور لاکھوں دلوں کے لیے ہدایت، سکون اور برکت کا مرکز بنا ہوا ہے۔آپ کی درگاہ صرف ایک مزار نہیں، بلکہ ایک زندہ روحانی روایت کا استعارہ ہے، جو انسان دوستی، رواداری اور الٰہی محبت کا پیغام دیتی ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی تعلیمات برصغیر میں ایک ایسے عہد کی یاد دلاتی ہیں جب مذہب اور انسانیت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ان کی زندگی کا مقصد انسانوں کے درمیان محبت، بھائی چارہ، اور امن قائم کرنا تھا۔آج کے انتشار اور نفرت کے دور میں، اگر ہم حضرت نظام الدین اولیاء کی تعلیمات کو اپنائیں تو معاشرہ امن، ہم آہنگی، اور روحانی سکون کا گہوارہ بن سکتا ہے۔☆☆☆

آئینۂ وطن

"وندے ماترم"

عقیدۂ توحید پر کاری ضرب

حافظ افتخار احمد قادری

اس وقت ملک میں ایسی فکری گہما گہمی برپا ہے جس نے معاشرتی مکالمے کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ سیاسی اسٹیج ہو، تعلیمی ادارے ہوں یا میڈیا کے مباحث ہر جگہ مذہب اور قومیت کے نام پر ایسی بحثیں ابھاری جارہی ہیں جن کا مقصد زیادہ تر جذبات کو مشتعل کرنا اور ایک مخصوص بیانیہ سامنے لانا ہے۔ خصوصًا اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کے عقائد پر بحث کرنا، ان کے ایمان ویقین کی آزمائش لینا اور ان کی وفاداری کو کسوٹی پر تولنا آج بعض حلقوں کا وطیرہ بن چکا ہے۔ ایسے ماحول میں وندے ماترم کا مسئلہ دوبارہ اس شدت کے ساتھ اٹھایا جانا محض ایک اتفاق نہیں بلکہ ایک منظم فکری دباؤ کی مثال ہے۔ اسلام کی بنیادی اور سب سے عظیم خوبی عقیدہ توحید ہے۔ یہ عقیدہ ایسا نازک، دقیق اور مقدس ہے کہ اس میں ذرہ برابر شراکت بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا اور اس کی الوہیت میں کوئی دوسرا شامل نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس پر پوری اسلامی عمارت قائم ہے۔ یہ عقیدہ کس قدر حساس ہے اس کا اندازہ اس واقعے سے لگائیے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ماشاء اللہ و شئت یعنی جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ اللہ کے محبوب ﷺ نے سختی سے ٹوکا اور فرمایا: کیا تم نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا؟ بلکہ یوں کہو کہ جو اللہ چاہے پھر آپ چاہیں۔ (نسائی) یہ تنبیہ بتاتی ہے کہ اسلام میں توحید کا معیار کس قدر بلند اور غیر مصلحت پسند ہے۔ مسلمان اپنے دل، زبان وعمل اور اپنی عبادت میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معبود مانتا ہے۔ وہ کسی اور کے سامنے جھک نہیں سکتا، اس کی تعظیم میں الوہیت کی حد تک نہیں جاسکتا، نہ اسے سجدہ کر سکتا ہے اور نہ اسے پوج سکتا ہے۔ اسی ذوقِ توحید کے پیش نظر مسلمان ہمیشہ سے ان الفاظ، نظریات، علامتوں اور رسومات سے اجتناب کرتے آئے ہیں جن میں شرک کا شائبہ بھی ہو۔

اسی پس منظر میں جب موجودہ سیاسی فضا میں وندے ماترم کو ایمان کا معیار بنا کر پیش کیا جاتا ہے تو مسلمان فطری طور پر چونک اٹھتا ہے۔ کیوں کہ یہ صرف ایک گیت نہیں بلکہ اپنی اصل، اپنے مفہوم، اپنے پس منظر اور اپنے استعمال کے اعتبار سے ایک ایسا کلام ہے جس میں صریح طور پر وہ تصورات موجود ہیں جنہیں اسلام کسی بھی حال میں قبول نہیں کر سکتا۔ وندے ماترم بنیادی طور پر بنگلہ ادیب بنکم چندر چٹرجی کے ناول آنند مٹھ کا حصہ ہے۔ یہ ناول کسی غیر جانبدار فضا میں نہیں لکھا گیا بلکہ اس کی بنیاد ہی مسلمانوں کے خلاف نفرت، تاریخی مسخ کاری اور ایک مخصوص مذہبی رومانی تصور پر قائم ہے۔ ناول میں انگریزوں کو ہندوؤں کا نجات دہندہ قرار دیا گیا اور مسلمان حکمرانوں کو ظالم و جابر دکھایا گیا ہے۔ اسی ناول کے اندر مختلف مذہبی گروہ کے سامنے یہ گیت گاتے ہیں جو ہندوؤں میں ماں کے مرتبے پر فائز ہیں۔ گیت میں وطن کو مختلف دیویوں کا روپ قرار دیا گیا۔ اسے پوجا کے قابل سمجھا گیا ہے۔ باضابطہ درگا استھاپنا کی طرح ملک کی مٹی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر جھکنے کا تصور پیش کیا گیا۔ اس میں وطن کی مٹی کو دین اور ایمان کا درجہ دیا گیا، اسے نجات دہندہ،

iftikharahmadquadri@gmail.com

حفاظتی قوت اور الوہی صفات کا مالک بتایا گیا۔ خاک وطن کی پرستش، عبادت اور اس کے آگے وندنا کا حکم دیا گیا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ تمام تصورات قطعی ناقابل قبول ہیں۔ مسلمان وطن سے محبت کرتا ہے، اسے عزیز رکھتا ہے، اس کے لیے جان دے سکتا ہے، اس کی حفاظت کو فرض سمجھتا ہے لیکن اس کی عبادت نہیں کر سکتا۔

جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا جیسے بڑے سیاسی اور سماجی رہنما بھی وندے ماترم کے بعض حصوں کو قومیت کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ آزادی کے بعد جب قومی ترانے کے انتخاب کا معاملہ آیا تو ایک بڑی کوشش کے باوجود اسے قومی گیت بنانے سے گریز کیا گیا۔ اس کی جگہ رویندر ناتھ ٹیگور کے جن گن من کو اختیار کیا گیا کیونکہ اس میں ایسی مذہبی تقدیس کا پہلو موجود نہ تھا جو کسی کمیونٹی کے عقیدے سے ٹکراتا ہو۔ یہاں ایک بنیادی سوال کھڑا ہوتا ہے کہ کیا کسی شہری کی حب الوطنی کا ثبوت کسی مخصوص مذہبی گیت کی تلاوت سے ہی دیا جا سکتا ہے؟ کیا وطن سے وفاداری کا معیار وہ الفاظ ہوں گے جو ایک خاص مذہبی شناخت رکھتے ہوں؟ کیا کوئی ریاست یا معاشرہ اپنے شہریوں کو ایسا کلام پڑھنے پر مجبور کر سکتا ہے جس کے مفہوم سے اس کے عقائد مجروح ہوتے ہوں؟ مسلمانوں سے محبتِ وطن کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے وندے ماترم پڑھوانا سراسر ناانصافی ہے۔

اسلام ایک فطری دین ہے۔ وہ وطن سے محبت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو دیکھ کر فرمایا: تو مجھے سب سے پیارا ہے اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں یہاں سے نہ جاتا۔ یہ جذبہ محبتِ وطن کی اعلیٰ ترین مثال ہے مگر یہ محبت عبادت میں تبدیل نہیں ہوتی نہ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا! وندے ماترم کا معاملہ کوئی سیاسی نعرہ یا معمولی موسیقی کا مسئلہ نہیں یہ اسلامی عقیدے کے عین قلب سے ٹکرانے والی ایک فکری حقیقت ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔ مسلمان اپنی وفاداری، خدمات، قربانیوں اور اپنی محنت کے ذریعے ثابت کرتا ہے کہ یہ ملک اس کا ہے اور وہ ملک کا مگر اس کے ایمان کی قیمت وہ الفاظ نہیں ہو سکتے جو اسے اپنی توحید سے محروم کر دیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وندے ماترم اپنے اصل اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے اسلامی عقیدہ توحید سے متصادم ہے۔ اسے پڑھنا مسلمان کے لیے جائز نہیں ہو سکتا اور کسی بھی مسلمان شہری یا بچے کو اس کے لیے مجبور کرنا صریح ناانصافی، مذہبی آزادی کی خلاف ورزی اور دستور کی روح کے منافی ہے۔ وطن سے محبت ایمان کا فطری حصہ ہے مگر وطن کی پرستش ایمان کے منافی ہے۔ یہ نکتہ نہ صرف سمجھنے بلکہ سمجھانے کے قابل بھی ہے تاکہ ملک میں امن و اعتدال اور باہمی احترام کی فضا قائم رہے۔

آج جب ملک کا سیاسی منظر نامہ شدید پولرائزیشن کا شکار ہے اور قومیت کے نام پر مذہبی علامات کو دانستہ طور پر مذہبی اقلیتوں پر مسلط کیا جا رہا ہے، وندے ماترم کا مسئلہ بھی اسی سیاسی حکمتِ عملی کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جذبات کے بھنور میں بہنے کے بجائے حکمت، بصیرت، قانون کی روشنی اور اپنے دینی شعور کے ساتھ قدم اٹھائیں۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ موجودہ حکومت وندے ماترم جیسے حساس مذہبی مسئلے کو صرف ایک گیت یا ایک رسمی نظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ اس کے ذریعے اکثریتی جذبات بھڑکائے جاتے ہیں، اقلیتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان کی وفاداری کا امتحان لیا جاتا ہے اور انتخابی سیاست کا ایندھن مہیا کیا جاتا ہے۔

وندے ماترم کا وہ حصہ جس میں وطن کو الوہی صفات دی گئی ہیں، اسے دیوی کا روپ دیا گیا ہے، اس کے آگے جھکنے کا حکم ہے اور اسے پوجا کے قابل سمجھا گیا ہے، مسلمان اسے نہ پڑھ

سکتا ہے، نہ اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ ایسی کوئی توقع کسی آئینی ریاست میں روا رکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا! مسلمان اپنی اس دینی پوزیشن کو پوری شائستگی اور اعتماد کے ساتھ برقرار رکھیں۔ اپنا موقف نہ گھٹائیں، نہ چھپائیں، نہ خوف میں بدلیں۔ اس امت نے ہمیشہ حق کے ساتھ کھڑے ہو کر جینا سیکھا ہے مگر ساتھ ہی حکمت اور حلم سے کام لینے کا درس بھی دیتی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اپنے آئینی حقوق سے واقف ہونا چاہیے۔ دستورِ ہند انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے، اسے ماننے، اس کی تعلیم دینے اور اپنے ضمیر کے مطابق زندگی گزارنے کا ناقابلِ تنسیخ حق دیتا ہے۔ کسی طالب علم کو کسی مذہبی یا نظریاتی کلام کی تلاوت پر مجبور کرنا آئین کی روشنی میں بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ اس لیے والدین، سرپرست، سماجی تنظیمیں اور تعلیمی اداروں کے ذمہ دار افراد اپنے قانونی حقوق کو سمجھیں اور اگر کہیں ان حقوق کو پامال کیا جا رہا ہو تو دستوری طریقوں سے اس کا دفاع کریں۔ قانون کے راستے کھلے ہیں، اس لیے جذباتی نعروں کے بجائے دستوری پلیٹ فارم کو استعمال کیا جائے۔

مسلمان انتشار، غصے اور ردعمل کی سیاست میں خود کو نہ جھونکیں۔ قوم سے محبت اور اپنے عقیدے سے وفاداری کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ جذباتی تقاریر، سڑکوں پر ٹکراؤ یا تنازع کے راستے کے بجائے اپنے موقف کو علمی، اخلاقی اور قانونی بنیادوں پر پیش کریں۔ جہاں ضرورت ہو، وہاں اہل علم، مفتیانِ کرام اور دانشور اس مسئلے کی اصل حیثیت عوام کو بتائیں تاکہ عام مسلمان کنفیوژن اور دباؤ سے بچ سکیں۔ خصوصاً نوجوان طبقے کو جذبات کی بجائے حکمت کا راستہ سکھایا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ اسلام ہمیں جذبات سے زیادہ دلیل، صبر، ثابت قدمی اور شائستگی کا راستہ دکھاتا ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے اندر تعلیم، شعور اور اعتماد میں اضافہ ہونا چاہیے۔ آج جس قوم کے پاس اپنی روایت، تاریخ اور اپنے حقوق کا شعور ہوتا ہے اسے خوف دلایا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا! والدین اپنے بچوں کو نہ صرف دینی تعلیم دیں بلکہ انہیں یہ بھی سکھائیں کہ اپنے آئینی اور سماجی حقوق کو کیسے سمجھ کر استعمال کرنا ہے۔ مدارس، کالجز اور تنظیمیں ایسے مسائل کے متعلق علمی مواد تیار کریں تاکہ مسلمان جذبات سے نہیں علم سے جواب دیں۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کو ملک کے اندر مثبت کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنے پڑوسیوں سے بہتر تعلقات، سماج کے خیر خواہ بن جانا، خدمت، تعلیم، تجارت، اخلاق، دیانت، خیرات یہ سب وہ پہلو ہیں جن سے مسلمان اپنی وفاداری اور اپنے قومی کردار کو ثابت کر سکتے ہیں بغیر اس کے کہ وہ اپنی توحید پر کوئی سمجھوتا کریں۔ جو قوم اپنے کردار سے پہچانی جائے اسے کوئی گیت پڑھ کر حب الوطنی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اندر اتحاد اور باہمی مشاورت قائم ہو۔ مختلف جماعتیں، تنظیمیں، ادارے اور علمائے کرام الگ الگ آواز اٹھانے کے بجائے ایک متحدہ، متوازن اور غیر جذباتی موقف پیش کریں۔ اس سے امت کے اندر اعتماد بڑھے گا اور بیرونی دنیا کو بھی ایک واضح اور مدلل پیغام جائے گا۔ مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ وندے ماترم کا مسئلہ وقتی نہیں بلکہ فکری چیلنج ہے۔ اسے وقتی ردعمل سے نہیں بلکہ بلند فکری سطح، دانش مندی، آئینی شعور اور دینی غیرت کے ساتھ حل کرنا ہوگا۔ مسلمان نہ تو زبردستی کسی باطل نظریے کو قبول کریں اور نہ ہی اپنی شرافت و تہذیب کو چھوڑیں۔ ان کا راستہ وہی ہے جو تاریخِ اسلام نے ہمیشہ دکھایا ہے۔ عقیدے پر استقامت، کردار میں پختگی، زبان میں شائستگی اور قانون کے دائرے میں مضبوط کھڑے رہنا۔ یقیناً ایمان کی حفاظت پہلی ترجیح ہے اور وطن کی خیر خواہی اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ آج کے اس انتشار بھرے ماحول میں مسلمان جب اپنے ایمان کے ساتھ اپنے آئینی حق کا تحفظ کریں گے تو یہی طرزِ عمل ملک میں امن، رواداری، باہمی احترام اور صحیح معنوں میں جمہوری فضا کو فروغ دے گا۔ ■■■■■■

آس پاس

لوگ کیا کہیں گے !!!

انیس الرحمٰن حنفی رضوی بہرائچ شریف

ہمارے معاشرے میں ایک ایسا جملہ رائج ہے جس نے نہ صرف افراد کی زندگی کو جکڑ رکھا ہے بلکہ ان کے خوابوں، فیصلوں اور خوشیوں پر بھی پہرے بٹھا دیے ہیں۔ وہ جملہ ہے: لوگ کیا کہیں گے ؟۔ یہ فقرہ چھوٹا سا ہے لیکن اس کے اثرات بہت وسیع اور گہرے ہیں۔ اسی ایک جملے نے ہمارے نوجوانوں کی جرأتِ فکر کو دبا دیا، ہمارے علما و ائمہ کی آزادانہ تبلیغ کو محدود کر دیا، اور ہمارے گھروں میں خوف و دباؤ کی فضا قائم کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتا رہے گا۔ انسان چاہے نیکی کرے یا برائی، ہر حال میں رائے زنی اور تنقید کا نشانہ بنے گا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی صفت یہ بیان فرمائی ہے: "وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ" (سورۂ مائدہ، آیت 54)

یعنی وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ پس اصل پیمانہ لوگوں کی رائے نہیں بلکہ اللہ کی رضا ہے۔

لوگ کیا کہیں گے ؟" کی نفسیاتی اور سماجی بنیاد-

یہ سوچ انسانی فطرت کے اس پہلو سے جڑی ہے کہ انسان فطری طور پر دوسروں کی رائے کو اہمیت دیتا ہے۔ مگر جب یہ رجحان اعتدال سے بڑھ جائے تو ایک نفسیاتی بیماری بن جاتا ہے۔ اس کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

1. **ہم رنگی کا رجحان:** لوگ سمجھتے ہیں کہ اکثریت جو کر رہی ہے، وہی درست ہے، لہٰذا وہی اپنانا چاہیے۔

2. **بدنامی کا خوف:** معاشرتی دباؤ کی وجہ سے افراد اپنے درست فیصلے ترک کر دیتے ہیں۔

3. **خاموشی کا چکر:** بہت سے لوگ حق جانتے ہیں مگر بولنے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں بدنام نہ ہو جائیں۔

4. **اجتماعی وہم:** ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ باقی سب ایک مخصوص رائے رکھتے ہیں، لہٰذا وہ بھی چپ ہو جاتا ہے۔

یہ تمام عوامل فرد کی شخصیت کو کمزور، اس کی خود اعتمادی کو مجروح، اور اس کی نیت کو ریاکاری کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

شرعی نقطۂ نظر: اسلام کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے جواب دہ ہے، نہ کہ لوگوں کے سامنے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: "فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ" (سورۂ مائدہ، آیت 44)

ترجمہ: لوگوں سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو۔

اسی طرح فرمایا: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ" (سورۂ نساء، آیت 135)

یعنی عدل پر قائم رہو اور اللہ کے لیے گواہی دو خواہ وہ گواہی تمھارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ" (صحیح بخاری)

ترجمہ: جب تمھارے اندر حیا باقی نہ رہے تو پھر جو چاہو کرو۔

یہ تمام نصوص اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اصل معیار "اللہ کی رضا" ہے، نہ کہ لوگوں کی خوشنودی۔

علماء، فارغین اور ائمہ پر اثرات: یہ جملہ "لوگ کیا کہیں گے ؟" خاص طور پر دینی حلقوں میں زیادہ کارفرما نظر آتا ہے۔

1. **علمی و تحقیقی میدان:** نئے فارغین بعض اوقات حساس موضوعات پر تحقیق یا اظہارِ رائے سے گریز کرتے ہیں کہ کہیں معاشرے یا کمیٹی کو ناگوار نہ گزرے۔

استاد و ناظم تعلیمات جامعہ خوشتر رضائے فاطمہ گرلس اسکول سوار ضلع رامپور یوپی-9517223646

2. **خطبات و دروس:** ائمہ مساجد اپنی تقاریر میں ان مسائل پر گفتگو کرنے سے بچتے ہیں جن پر اصلاح کی ضرورت ہے، صرف اس خوف سے کہ نمازی یا محلہ والے اعتراض نہ کریں۔

3. **سماجی فیصلے:** شادی بیاہ، تعلیم اور معاشی معاملات میں اکثر لوگ اپنی مرضی کے بجائے محض معاشرتی دباؤ کے تابع ہو جاتے ہیں۔ یہ رویے نہ صرف فرد کی دینی بصیرت کو کمزور کرتے ہیں بلکہ معاشرے کو بھی جمود کا شکار بنا دیتے ہیں۔

شرعی اصول اور عرف کا توازن: فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: "العرف معتبر ما لم يخالف الشرع" یعنی عرف معتبر ہے جب تک کہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔

یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ عوامی رائے یا معاشرتی دباؤ شریعت کا معیار نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی عمل شریعت کے موافق ہے تو اسے محض "لوگ کیا کہیں گے" کی بنا پر ترک کرنا درست نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی عرف شریعت سے متصادم ہو تو اسے اختیار کرنا ناجائز ہے خواہ معاشرے میں وہ کتنا ہی رائج ہو۔

عملی نقصانات: "لوگ کیا کہیں گے" کی سوچ کے چند بڑے نقصانات درج ذیل ہیں:

1. **روحانی نقصان:** نیت کا اخلاص متاثر ہوتا ہے، ریاکاری اور دکھاوے کا رجحان بڑھتا ہے۔

2. **فکری نقصان:** علمی آزادی ختم ہو جاتی ہے، سطحی مسائل پر زور بڑھ جاتا ہے، تحقیق واجتہاد کمزور ہو جاتے ہیں۔

3. **سماجی نقصان:** اصلاحِ احوال کی کوششیں دم توڑ دیتی ہیں، حق بات دب جاتی ہے۔

4. **نفسیاتی نقصان:** انسان مسلسل دباؤ اور خوف میں رہتا ہے جس سے ذہنی سکون اور خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔

5. **معاشی نقصان:** افراد اپنی معاشی آزادی کو کھو کر محض دوسروں کی خوشنودی کے لیے غلط فیصلے کر بیٹھتے ہیں۔

سیرت اور تاریخ کے نمونے: انبیاء علیہم السلام کی زندگی اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ لوگوں کی مخالفت کے باوجود حق پر ڈٹے رہے۔ امام احمد بن حنبل نے "محنۃ القرآن" کے دور میں ظلم سہ لیا مگر حق سے پیچھے نہ ہٹے۔ امام ابو حنیفہ نے منصبِ قضا قبول نہ کیا تاکہ دین کی آزادی برقرار رہے۔ امام مالک نے فرمایا: "ہر شخص کی بات لی بھی جا سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی ہے سوائے نبی کریم ﷺ کے۔"

یہ تمام مثالیں اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ حق گوئی اور استقلال کی قیمت بسا اوقات ملامت اور تکالیف ہوتی ہے مگر یہ راہ ہی اصل کامیابی کی راہ ہے۔

عملی لائحۂ عمل: اب سوال یہ ہے کہ اس سوچ سے نجات کیسے حاصل کی جائے؟ اس کا جواب درج ذیل اقدامات میں پوشیدہ ہے:

فردی سطح پر: 1. نیت کو درست کر کے ہر عمل کو اللہ کی رضا کے لیے خالص کیا جائے۔ 2. اپنے اصول اور حدود طے کر لیے جائیں کہ کن امور پر سمجھوتہ ممکن نہیں۔ 3. علمی اور دعوتی ذمہ داریوں کو حکمت کے ساتھ ادا کیا جائے، مگر حق بات کو ترک نہ کیا جائے۔ 4. معاشی خود کفالت کی طرف توجہ دی جائے تاکہ دوسروں کا دباؤ کم ہو۔ 5. تنقید کو علمی انداز میں سنا اور پرکھا جائے، اور بلاوجہ کی باتوں کو نظر انداز کیا جائے۔

ادارہ جاتی سطح پر: 1. مساجد اور مدارس میں امام و کمیٹی کے درمیان واضح اصول طے ہوں تاکہ بلاوجہ مداخلت نہ ہو۔ 2. اصلاح کے معیار مقبولیت نہیں بلکہ مؤثریت ہو۔ 3. غیبت، بدگمانی اور بے جا اعتراض کے سدباب کے لیے شفاف نظام بنایا جائے۔ 4. ائمہ اور اساتذہ کے لیے تربیتی نشستیں منعقد کی جائیں تاکہ وہ عصرِ حاضر کے مسائل کو حکمت سے حل کر سکیں۔

معاشرتی سطح پر: 1. والدین اور سرپرستوں کو یہ شعور دیا جائے کہ فیصلے اللہ کی رضا اور عقلِ سلیم کے مطابق ہونے چاہئیں، نہ کہ صرف معاشرتی دباؤ کے مطابق۔

2. نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ اصل معیار "اللہ کیا چاہے گا" ہے، "لوگ کیا کہیں گے" نہیں۔ ☆☆☆

یادِ ماضی

تاریخ اور تاریخی مطالعات

مہتاب پیامی

تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جو ماضی کو اس کی تمام تر اچھائیوں اور برائیوں، نعمتوں اور لغزشوں کے ساتھ بالکل ویسا ہی منعکس کرتا ہے جیسا کہ وہ حقیقت میں تھا، نہ کہ ویسا جیسا ہونا چاہیے تھا یا جیسا ہم اپنی خواہشات کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے دیکھا جائے تو تاریخ، حال کے لیے درس و عبرت کے ساتھ روشنی کا دروازہ ہے اور مستقبل کے لیے فکر و آگہی کا سرچشمہ۔ وہ قومیں جو اپنی تاریخ کو درست انداز میں مدون نہیں کرتیں، اس پر فخر نہیں کرتیں اور اس کی خطاؤں اور درستیوں سے سبق حاصل نہیں کرتیں، وہ دوسری اقوام کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔ بلکہ کوئی بھی قوم اس وقت تک اپنے لیے تہذیب، ثقافت اور اقوامِ عالم میں ایک معتبر مقام پیدا نہیں کر سکتی جب تک وہ ماضی کا مطالعہ نہ کرے، حال کو سنوارے اور مستقبل کی سمت کا شعوری ادراک نہ حاصل کرے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے ادوارِ عروج میں تاریخ کو **"ابو العلوم"** کہا جاتا تھا، اس لیے کہ یہ علم، اعتماد کو مضبوط کرتا ہے اور زندگی کی عملی درسگاہ بن جاتا ہے۔ تاریخ کی قراءت و کتابت اقوام اور نسلوں کے اعتماد کی بحالی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے، بالخصوص اُن زمانوں میں جب تہذیبی مسابقت عروج پر ہو، غالب تہذیب کی ثقافتی بالادستی مسلط ہو، اور اسلام کے ساتھ مغربی فکری کشمکش شدت اختیار کر جائے۔ ایسے حالات میں مسابقتی اقدار اور ایک مضبوط تاریخی شعور کے ذریعے تہذیبی و ثقافتی چیلنجز کا مقابلہ مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔

جارج سنتیانا (George Santayana (1863–1952 اپنے کتاب "دی لائف آف ریزن" میں لکھتے ہیں:

"Those who cannot remember the past are condemned to repeat it."

یہ اقتباس براہِ راست اس نکتے کی تائید کرتا ہے کہ تاریخ سے سبق نہ لینے والی اقوام زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔

فرانسیسی مورخ مارک بلوش Marc Bloch (1886–1944) نے لکھا:

"L'incompréhension du présent naît fatalement de l'ignorance du passé."

یعنی حال کی ناسمجھی لازماً ماضی کی ناآگہی سے جنم لیتی ہے۔

تاریخ نویسی، اس کی اہمیت اور اس کے ضوابط کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ خود تاریخ کی حقیقت اور اس کے مفاہیم کو جانا جائے۔ اسی تناظر میں ابن خلدون نے فنِ تاریخ کی جو جامع تعریف پیش کی ہے، وہ تاریخ فہمی کی اساس سمجھی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

إنه من الفنون التي تتداوله الأمم والأجيال وتُشدّ إليه الرّكائب والرّحال، وتسمو إلى معرفته السُّوقة والأغفال، وتتنافس فيه الملوك والأقيال [الرؤساء]، وتتساوى في فهمه العلماء والجهَّال، إذ هو في ظاهره لا يزيد على أخبار عن الأيّام والدول، والسّوابق من القرون الأول، تنمو فيها الأقوال، وتُضْرب فيها الأمثال، وتُطرف بها الأندية إذا غصَّها الاحتفال، وتؤدّي

payamee@gmail.com/ashrafiamonthly@gmail.com ontact:9235647041

لنا شأن الخليقة كيف تقلبت بها الأحوال، واتّسع للدول فيها النِّطاق والمجال، وعمَّروا الأرض حتّى نادى بهم الارتحال، وحان منهم الزوال، وفي باطنه نظر وتحقيق، وتعليل للكائنات ومبادئها دقيق، وعلم بكيفيّات الوقائع وأسبابها عميق، فهو لذلك أصيل في الحكمة عريق، وجدير بأن يُعدَّ في علومها وخليق.(عبدالرحمن بن خلدون، مقدمة ابن خلدون، تحقيق خليل شحادة، بيروت: دار الفكر، 1421ھ/ 2001م، ص6)

ترجمہ: تاریخ اُن فنون میں سے ہے جنھیں اقوام اور نسلیں ایک دوسرے سے منتقل کرتی آئی ہیں، جن کے لیے سفر کیے جاتے ہیں اور جن کی طلب میں سواریوں کے کجاوے کسے جاتے ہیں ۔ اس کی معرفت کی جستجو عام لوگوں اور سادہ ذہنوں تک کو بلندی عطا کرتی ہے، اور اس میں بادشاہ اور سردار ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہیں۔ اس کی فہم میں عالم اور جاہل بظاہر برابر دکھائی دیتے ہیں، کیوں کہ اس کی ظاہری صورت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ ایام، سلطنتوں اور گزشتہ صدیوں کے حالات و واقعات کی خبریں بیان کرتا ہے، جن میں اقوال پہنچتے ہیں، مثالیں قائم کی جاتی ہیں، اور محفلوں کو رونق بخشی جاتی ہے۔ یہ ہمیں مخلوقات کے احوال سے آگاہ کرتا ہے کہ زمانے نے انھیں کس طرح کروٹیں بدل بدل کر دکھائیں، کیسے سلطنتوں کا دائرہ وسیع ہوا، انھوں نے زمین کو آباد کیا، یہاں تک کہ کوچ کا اعلان ہوا اور زوال کا وقت آپہنچا۔ لیکن اس کے باطن میں گہری نظر، دقیق تحقیق، موجودات اور ان کے مبادی کی باریک تعلیل، اور واقعات کی کیفیات و اسباب کا عمیق علم پوشیدہ ہے۔ اسی بنا پر تاریخ حکمت میں راسخ، اس کی جڑوں میں پیوست، اور اس کے علوم میں شمار کیے جانے کی پوری طرح اہل اور لائق ہے۔"

مغرب نے اپنے متاخر ادوار میں تاریخ کے مطالعے اور اس پر لکھنے کی غیر معمولی اہمیت کو بخوبی محسوس کر لیا۔ چنانچہ علمِ تاریخ، علمِ عمرانیات (سوشیالوجی) کے ساتھ مل کر علومِ انسانی کی ریڑھ کی ہڈی بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا کے اکثر ممالک میں تاریخ کے کالجوں اور شعبوں سے فارغ التحصیل افراد سیاست، قیادت، فکری رہنمائی، حتیٰ کہ ریاستی، عسکری اور سکیورٹی اداروں میں کلیدی مناصب تک پہنچے۔ یہ صورتِ حال اس امر کی متقاضی ہے کہ تاریخ نویسی کی منہجیات پر بار بار لکھا جائے، اس کی اہمیت اجاگر کی جائے اور اہلِ علم کو متنبہ کیا جائے، کیوں کہ تاریخ کی اصولی بنیادیں ہی صحیح فہم اور بیدار شعور کی بہترین کھڑکی ہیں۔

اسی منہجی شعور کے تحت ڈاکٹر محمد السلمی نے اپنے بلاگ میں تاریخ کی کتب کے مطالعے اور تحریر کے اسلوب و طریقۂ کار پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"التاريخ فن من الفنون المحببة إلى النفوس، وهو علم له أصول وقواعد، وله مصادر متعددة، ومناهج مقررة عند علماء الإسلام، وهو يعتني بمعرفة أخبار الماضين، وتحليل الحاضر، واستشراف المستقبل على ضوء السنن الإلهية التي تحكم سير حركة التاريخ وفق مشيئة الله وقَدَرِه، وهذه السنن مرتبطة بالأمر والنهي الرباني والاستقامة على ذلك أو عدمها. وقد أَلَّف أهل العلم في فنون التاريخ المختلفة؛ من الحوادث والأخبار، ومن قيام الدول وسقوطها، ومن التراجم للرجال على الطبقات والعصور، أو بحسب التخصصات العلمية والاتجاهات الفكرية، أو حسب الخصائص الإقليمية." (منهج القراءة في كتب التاريخ.) مدونة محمد بن صامل السلمي، بتاريخ ٢٠ أبريل ٢٠١٦م، الرابط التالي: (https://bit.ly/33Rlvef

"تاریخ انسانی نفوس کے لیے ایک محبوب فن ہے، مگر یہ محض فن ہی نہیں بلکہ ایک ایسا علم ہے جس کے اپنے اصول، قواعد، متنوع مصادر اور واضح مناہج ہیں، جنھیں علماے اسلام نے متعیّن کیا ہے۔ یہ علم ماضی کی خبریں جاننے، حال کا تجزیہ کرنے اور مستقبل کو اُن الٰہی سنّتوں کی روشنی میں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر کے مطابق تاریخ کی حرکت کو منظم کرتی ہیں۔ یہ سنتیں براہِ راست ربّانی اوامر و نواہی اور ان پر استقامت یا انحراف سے جڑی ہوئی ہیں۔ اسی بنا پر اہلِ علم نے تاریخ کے مختلف فنون میں تصنیفات کیں؛ کہیں واقعات و حوادث پر، کہیں ریاستوں کے عروج و زوال پر، کہیں طبقات و تراجم پر، کبھی زمانوں کے لحاظ سے، کبھی علمی تخصصات و فکری رجحانات کے اعتبار سے، اور کبھی علاقائی خصوصیات یعنی ممالک و شہروں کی بنیاد پر۔

علماے اسلام نے تاریخ نویسی میں متنوع اسالیب اختیار کیے۔ بعض کتابیں مردوں اور عورتوں کے علمِ طبقات پر قائم ہیں، بعض سیرت و تراجم پر مشتمل ہیں جو حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کی گئیں، اور کچھ ایسی ہیں جو سال بہ سال، عہد بہ عہد، اور واقعاتِ ایام و سِنین کی ترتیب پر لکھی گئیں۔ اسی طرح کچھ کتابیں ممالک اور خطوں کی تاریخ سے متعلق ہیں، جیسے بلاذری (متوفی 279ھ) کی "فتوح البلدان"۔ بعض کتب شہروں اور علاقوں کے علما کے تعارف پر مبنی ہیں، جیسے ابن حبان (متوفی 354ھ) کی تصنیف جو علماے امصار پر ہے؛ یا کسی ایک شہر کے علما پر خصوصی کتب، جیسے امام حاکم نیشاپوری (متوفی 405ھ) کی "تاریخ نیشاپور"، ابو القاسم حمزہ السہمی (متوفی 527ھ) کی "تاریخ جرجان"، خطیب بغدادی (متوفی 463ھ) کی "تاریخ بغداد"، اور ابن عساکر (متوفی 571ھ) کی "تاریخ دمشق" اور اس نوع کی بے شمار مثالیں اسلامی علمی ورثے میں موجود ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے ہاں تاریخی تحریر کی دیگر جہات بھی نہایت وسیع ہیں، جیسا کہ ابن جبیر (متوفی 614ھ) اور ابن بطوطہ (متوفی 779ھ) کے سفرنامے۔

اسلام، اپنی مختلف محرکات کے ساتھ، دنیا کے چھوٹے بڑے خطوں اور اقوام کے بارے میں علمی آگہی کے فروغ کا ایک زبردست محرک رہا ہے، جیسے تاریخ کے دیگر پہلوؤں میں رہا۔ اس موضوع میں تفصیل بہت ہے، مگر یہ اس کا محل نہیں۔

تاریخ نویسی میں انحرافات کی چند صورتیں:

اسلامی تاریخ بھی دیگر علوم کی طرح آزمائشوں اور انحرافات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ابتدائی صدیوں ہی سے مختلف محرکات اور متنوع مقاصد کے تحت اس میں تحریف کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس پر ابن خلدون نے نہایت دردمندی کے ساتھ گفتگو کی ہے، جہاں وہ حقیقی مؤرخین اور غیر مستند افراد کے درمیان واضح فرق کرتے ہوئے تاریخ میں مداخلت کرنے والوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسلام میں عظیم مؤرخین نے ایام و واقعات کی خبریں پوری جامعیت کے ساتھ جمع کیں، انھیں دفاتر کے اوراق میں محفوظ کیا؛ مگر لوگوں نے ان میں باطل کی سازشیں شامل کر دیں، جنھیں وہم و اختراع کے ساتھ گھڑ لیا، کمزور اور جعلی روایتوں کو زیب و زینت دے کر پیش کیا، اور بعد کے بہت سے لوگوں نے بغیر تحقیق انھی آثار کی پیروی کی اور انھیں ویسا ہی ہم تک منتقل کر دیا جیسا سنا تھا۔ انھوں نے نہ واقعات کے اسباب پر غور کیا، نہ حالات کی رعایت رکھی، نہ لغو روایتوں کو رد کیا۔ چنانچہ تحقیق نایاب ہو گئی، تنقیح کی نظر کمزور پڑ گئی، اور غلطی و وہم خبروں کے ساتھی بن گئے۔ تقلید انسانوں میں رچی بسی ہے، فنون میں دراندازی عام ہے۔ ناقل محض نقل کرتا ہے، جب کہ بصیرت صحیح کو پرکھتی ہے، اور علم دل کے آئینے کو جلا بخشتا ہے۔"

اس کے بعد ابن خلدون ان چند عظیم مؤرخین کا ذکر کرتے ہیں جو شہرت، امامت اور علمی وقار کے حقیقی مستحق تھے اور

واضح کرتے ہیں کہ ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

تاریخ اور اس کی روایات، اس کے رجال اور ریاستوں کے باب میں اس فکری انتشار کے سب سے نمایاں کرداروں میں بعض گروہ پیش پیش رہے، جن میں خاص طور پر روافض شامل ہیں، جنھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف تاریخ کو مسخ کرنے، ان کی کردار کشی کرنے اور من گھڑت روایات گھڑنے میں خاص مہارت دکھائی۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث طویل ہے، اور اہلِ تخصص نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

گزشتہ ادوار ہوں یا جدید زمانہ، تاریخ میں **تحریف وتزویر** کے منظر نامے کی قیادت اُن استشراقی حلقوں نے بھی کی جو بیش تر مغربی حکومتوں کی فکری، ادارہ جاتی اور مالی سرپرستی میں سرگرم رہے۔ اس منظم فکری یلغار پر اسلامی تاریخ کے ممتاز محقق ڈاکٹر **عمادالدین خلیل** نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

"لقد اعتمد كثير من الباحثين في التاريخ الإسلامي عبر القرنين الأخيرين، وبخاصة في دوائر الفكر الاستشراقي، والغربي عموماً، منهجاً معكوساً في التعامل مع هذا التاريخ، منهجًا ينطوي على محاولة متعمَّدة أو غير متعمَّدة، لفك الارتباط بين الإسلام وبين التاريخ. بل إن بعض المحاولات التي تبلغ أقصى حِدَّتها في الاستشراق اللاهوتي ثم الماركسي، أرادت لمفردات التاريخ الإسلامي أن تُبحر باتجاه مضادٍّ للمطالب الإسلامية، وأن تتخذ موقفاً نقيضاً لمعطيات هذا الدين وثوابته. وهكذا أُرغمت الوقائع على مغادرة رَحِمَها الحقيقي الذي اُنتزعت منه انتزاعاً لكي تتشكل وَفْقَ منهج خاطئ في بيئة غير بيئتها، ونقول أشياء غير التي قالتها بالفعل. وينتهي الأمر إلى صياغة شبكة من الاستنتاجات التي جعلها التكرار المتواصل بمنزلة مُسلَّمات لا تقبل نقضاً ولا جدلاً. ولقد تم بذلك حفر خندق عميق بين طرفي القضية".(عماد الدين خليل، مقال بعنوان: (قيمة التاريخ)، موقع قصة الإسلام، بتاريخ 11 يوليو 2010م، الرابط التالي (https://bit.ly/39THMf3

ترجمہ: گزشتہ دو صدیوں کے دوران اسلامی تاریخ کے بہت سے محققین، بالخصوص استشراقی اور عمومی طور پر مغربی فکری حلقوں میں، تاریخ سے معاملہ کرنے میں ایک الٹا منہج اختیار کیے رہے۔ یہ منہج دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام اور تاریخ کے باہمی ربط کو توڑنے کی کوشش پر مبنی تھا۔ بلکہ استشراق کے لسانی و مذہبی اور بعد ازاں مارکسی رجحانات میں یہ کوشش اپنی انتہا کو پہنچی کہ اسلامی تاریخ کے مفردات کو اسلامی مطالبات کے برخلاف سمت میں بہادیا جائے اور اس دین کی قطعی اساسات کے مقابل کھڑا کر دیا جائے۔ اس طرح تاریخی واقعات کو زبردستی ان کے حقیقی بطن سے جدا کر کے، ایک غلط منہج کے تحت، غیر مانوس ماحول میں نئی شکل دی گئی، حتیٰ کہ وہ باتیں کہلوانے لگے جو انھوں نے حقیقت میں کبھی کہی ہی نہ تھیں۔ آخر کار اس طرزِ فکر سے ایسے نتائج کا ایک پورا جال بُنا گیا اور عقیدے اور تاریخ کے درمیان ایک گہری خندق کھود دی گئی۔

عہدِ حاضر میں تاریخ نویسی کی ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ تاریخ کو محض ریاستوں اور حکومتوں، جنگوں، معاہدوں اور سیاسی کشمکش تک محدود کر کے پڑھا اور پڑھایا جائے، اور اس سے ملتِ اسلامیہ کی اجتماعی، سماجی، علمی اور تہذیبی زندگی کو بالکل الگ کر دیا جائے۔ اسی طرح اس کے علما، مفکرین، علمی ورثے اور تہذیبی سرمایہ کو اقوامِ عالم کے درمیان نمایاں کرنے سے بھی صرفِ نظر کر لیا جائے۔ ایک اور سنگین لغزش یہ ہے کہ روایات، اقوال اور خبروں کو شرعی میزان اور جرح و تعدیل کے اصولوں

پر پرکھے بغیر قبول کر لیا جائے، حالاں کہ تاریخ کو اس باب میں محدثین اور علما کی منہجیات سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح بغیر کسی معلوم سند اور قابلِ اعتماد راوی کے روایت کو قبول کرنا یا لکھ دینا بھی ایک خطرناک انحراف ہے۔ جس طرح طب کے اپنے ماہرین ہوتے ہیں، اسی طرح تاریخ بھی اپنے متخصّص اساتذہ اور اہلِ فن رکھتی ہے۔

ڈاکٹر محمد السلمی نے تاریخ کے مطالعے پر اپنی علمی تحریر کے اختتام پر لکھا:

"ويبقى أنه يحتاج لإتقان العلم إلى شيخ في التخصص يَدْرُس عليه العلمَ حتى يُتقنه، ويستشيره في كلِّ ما أشكل عليه من المسائل."

(محمد بن صامل السلمي، ورقة علمية بعنوان: منهج القراءة في كتب التاريخ. مدونة : محمد بن صامل السلمي، بتاريخ 20 أبريل 2016م، الرابط التالي : (https: / /bit.ly /33Rlvef.

ترجمہ: کسی بھی علم میں کامل مہارت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس فن کے کسی متخصّص استاد سے باقاعدہ طور پر علم حاصل کرے، یہاں تک کہ اسے اچھی طرح سمجھ لے، اور جن مسائل میں اشکال پیش آئے، ان میں اس سے مشورہ کرے۔

مائیکل پولانی (Michael Polanyi) (1891–1976) ایک ممتاز فلسفی، اور مفکر تھے۔ پولانی کی پہچان بالخصوص علم کی ماہیت (Theory of Knowledge)، سائنسی طریقِ کار اور انسانی فہم میں غیر مدوّن علم (Tacit Knowledge) کے تصور کی وجہ سے ہے۔ پولانی کا سب سے معروف نظریہ Tacit Knowledge ہے، جس کا خلاصہ وہ اس جملے میں بیان کرتے ہیں:

"We know more than we can tell."

یعنی ہم بہت کچھ ایسا جانتے ہیں جسے ہم مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتے۔

ان کے نزدیک علم صرف کتابوں، اصولوں اور واضح تعریفوں تک محدود نہیں، بلکہ اس کا ایک **بڑا حصہ تجربے، مشق،** شاگردی اور استاد کی قربت سے منتقل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی علم میں مہارت کے لیے apprenticeship (شاگردی) کو بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:

"Mastery of any discipline requires apprenticeship under a specialist."

یعنی کسی بھی علم یا فن میں کامل مہارت حاصل کرنے کے لیے کسی ماہر اور متخصّص استاد کی باقاعدہ شاگردی اور رہنمائی ضروری ہوتی ہے۔

تاریخ کے مطالعے یا تصنیف میں ایک بڑا انحراف یہ بھی ہے کہ اس میدان میں وہ لوگ آگے آ بیٹھیں جو اس فن کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ ایسے افراد واقعات کو اپنی خواہش اور ذاتی رجحان کے مطابق بیان کرتے ہیں، بغیر کسی ذمہ داری اور علمی دیانت کے؛ گویا تاریخ کوئی ذاتی جاگیر ہو جس سے جیسے چاہیں کھیلیں، یا تاریخ پڑھنا اور لکھنا محض تفریح اور کھیل تماشا ہو! اس تناظر میں ڈاکٹر محمود محمد شاکر کا یہ قول نہایت اہم ہے:

"التاريخ لا يُكتب بالتحكُّم، وإنما يُكتب بالرواية، ثم الاستدلال ثم يُبذل الجهد في سد الفجوات، وسبيل ذلك أن نأخذ من الماضي أسباباً وعللاً وحوادثَ ذات خطر، فإن استقامت أن تمتد معك إلى الحاضر الذي تؤرخه، فهي حقيقةٌ بأن تكون شيئاً من التاريخ يوشك أن يكون حقاً كلُّه أو بعضُه."(محمود محمد شاكر، الفتنة الكبرى، مجلة الرسالة، القاهرة، فبراير 1984م، ص193 – 196، الرابط التالي: https://bit.ly/32P1Pqt)

ترجمہ: تاریخ زبردستی اور من مانی سے نہیں لکھی جاتی،

بلکہ روایت سے، پھر استدلال سے، اور اس کے بعد خلاؤں کو پُر کرنے کے لیے علمی محنت سے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ماضی سے اسباب، علل اور اہم واقعات اخذ کیے جائیں، اور اگر وہ حال تک صحیح طور پر جُڑ جائیں جسے تم تاریخ بنا رہے ہو، تو وہ حقیقت کے قریب ہو جاتے ہیں، کبھی پورے کے پورے اور کبھی کسی حد تک۔

اسی لیے تاریخی مسائل میں روایت اور استدلال کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے، خصوصاً جب ان کے ساتھ معاشرتی زندگی کی قدیم دستاویزات بھی شامل ہو جائیں، جو کسی بھی معاشرے یا بستی کے زمان و مکان کے احوال کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہیں۔

تاریخ کو مسخ کرنے والی ایک نہایت خطرناک صورت یہ بھی ہے کہ اس کی تفسیر غلط مناہج کے ذریعے کی جائے، حالاں کہ اسلام میں تاریخ کی تفسیر بھی ایک منضبط علمی منہج پر قائم ہے، جو محض مطالعے کے منہج سے کم اہم نہیں۔ اسی اصولی بنیاد پر ڈاکٹر محمد السلمی نے اپنی معروف کتاب "منهج كتابة التاريخ الإسلامي" تصنیف کی، جو آج ہر محقق اور مؤرخ کے لیے ایک مضبوط علمی رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ تاریخ اور اس کی تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"الحدث التاريخي: هو فعل الإنسان، بما يحمله من أفكار وتصورات، وما لديه من قدرات وإمكانات، وما يعتمل في نفسه من الرغبات والشهوات، ومن القيم والفضائل والاعتقادات في زمان ومكان من هذا الكون الفسيح المحكوم بمشيئة الله وعلمه وقدرته."(محمد بن صامل السلمي، مقال بعنوان: (كيف نفسر التاريخ؟)، مدونة د. محمد بن صامل السلمي، 17 أبريل 2016م، الرابط التالي https://bit.ly/33NZs84)

ترجمہ: تاریخی واقعہ دراصل انسان کا وہ عمل ہے جو اس کے افکار و تصورات، اس کی صلاحیتوں و امکانات، اس کے باطنی جذبات، خواہشات و شہوات، اور اس کی اقدار، فضائل اور اعتقادات کے ساتھ، ایک خاص زمان و مکان میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس وسیع کائنات میں ہوتا ہے جو اللہ کی مشیت، علم اور قدرت کے تحت ہے۔

اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخ کی تفسیر کے بنیادی ارکان تین ہیں: (1) انسان (2) زمان، (3) مکان، اور مشیتِ الٰہیہ۔ تاریخ کی صحیح تفسیر انھی ارکان کے بارے میں درست تصور اور ان کے باہمی تعلق کی صحیح تفہیم کا نام ہے۔ جو شخص صحیح تصور رکھتا ہو کتاب و سنت کی طرف رجوع کرے، وہ پوری انسانی تاریخ کی درست تفسیر کر سکتا ہے، کیوں کہ ان مصادر میں وہ باتیں واضح کر دی گئی ہیں جن کے تحت واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں اور جن کی بنیاد پر اقوام، ریاستوں اور افراد کا محاسبہ ہوتا ہے۔

بے شک یہ پوری کائنات، انسان، اس کے اعمال، اس کی ایجادات اور صنعتیں، سب کی سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں؛ لہٰذا مخلوق کو سمجھنے کے لیے خالق کی طرف رجوع ناگزیر ہے، اور جب ہم وحیِ الٰہی کی طرف لوٹتے ہیں تو راستے خود بخود متعیّن ہو جاتے ہیں۔

ان علمی مناہج اور اصولوں کے مطابق تاریخ کو پڑھنے اور لکھنے، اور تدوین میں پائے جانے والے انحرافات سے تجاوز کے نتیجے میں، مستشرقین اور ان کے شاگردوں کی وہ جھوٹی اور مسخ شدہ تحریریں بڑی حد تک اپنی حیثیت کھو بیٹھیں، جو انھوں نے اسلامی تاریخ کے بارے میں بعض کتب اور روایات میں شامل کر دی تھیں، اور جنھیں بعض عرب و اسلامی ممالک کے تعلیمی نصاب تک میں داخل کر دیا گیا تھا۔

یہ سب کچھ استعمار کے اُس دور کے ساتھ جڑا ہوا تھا جب مسلم دنیا پر قبضہ کر کے اس کی تاریخ کو مٹانے اور مسخ کرنے کی کوشش کی گئی؛ خصوصاً صلیبی جنگوں کے بعد جو تقریباً دو صدیوں

تک جاری رہیں۔

مگر اس تاریک دور کے بعد علم، معرفت اور دین میں ایک نئی بیداری نے جنم لیا، اور تاریخ کو بھی دیگر علوم کی طرح اس کا حق ملا۔ مسلمانوں میں اپنے تاریخ، اپنی عظمت، اپنی تہذیب اور صحیح مصادر کے حوالے سے شعور بیدار ہوا، بلکہ اس پر فخر کا جذبہ بھی بیدار ہوا۔

یوں مسلمانوں کی جامعات، تحقیقات اور علمی مطالعات پر مبنی علمی بیداری نے بڑی حد تک ان تحریروں کا اثر زائل کر دیا جو تاریخِ اسلام کے خلاف فکری جرم کی مرتکب تھیں اور جن میں تاریخ اور اسلام کے درمیان بدنما فکری تفریق پائی جاتی تھی۔ یہ تبدیلی اُس وقت رونما ہوئی جب تاریخ کے بہت سے علما اور اساتذہ نے اپنے دینی منہج پر اعتماد کے ساتھ تاریخ کو از سرِ نو پڑھنا اور لکھنا شروع کیا، اور اپنی اس اسلامی تہذیب کی داستان دوبارہ بیان کی جو ایک طویل عرصے تک دنیا پر غالب رہی اور دیگر تہذیبوں کے علوم و معارف پر گہرے اثرات چھوڑ گئی۔

ابتدائی ادوار کے مؤرخین کی چند نمایاں مثالیں:

ابتدائی اسلامی ادوار میں تاریخ کی تدوین کرنے والوں میں جن شخصیات کو عوام و خواص کے درمیان غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، ان میں سرِفہرست عظیم مفسر اور مؤرخ علامہ ابن کثیر ہیں، جن کی شہرۂ آفاق تصنیف "البدایہ والنہایہ" ہے۔ اسی طرح عظیم مفسر و مؤرخ علامہ ابن جریر طبری اپنی کتاب "تاریخ الأمم والملوک" کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ تاریخ و عمرانیات کے امام ابن خلدون، جن کی دو عظیم تصانیف "المقدمۃ" اور "تاریخ ابن خلدون" علمی دنیا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان مؤرخین کی کتابوں کی علمی اہمیت اور غیر معمولی شہرت کے باعث ان پر وسیع پیمانے پر علمی خدمت انجام دی گئی؛ جیسے تنقیحات، تدقیقات، مراجعات، روایات کی تخریج، شروحات اور اختصارات وغیرہ۔

ان عظیم مؤرخین اور ان کی تصانیف پر گفتگو کا مقصد یہاں محض اُن کی تدوینی منہجیات کے بنیادی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے، جو تاریخ کے محقق اور مصنف کے لیے نہایت مفید ہیں، بالخصوص اس زاویے سے کہ انھوں نے اس فن کے ساتھ کس طرح علمی سنجیدگی، اعتماد پیدا کیا۔

یہاں قاری کے لیے اصل توجہ کا نکتہ یہ ہے کہ ایک بار پھر تاریخ کے مطالعے اور تحریر میں درست منہج کی اہمیت کو یاد دلایا جائے، اور یہ یاد دہانی ان مشہور مؤرخین کے عملی نمونوں کے ذریعے ہو، جو نہ صرف تاریخ کے راوی اور مدوّن تھے بلکہ تاریخ کے مفسر بھی تھے۔

علامہ طبری (224–310ھ) کی احتیاط پسندی:

جب ہم امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری کی علمی زندگی، ان کے اساتذہ سے استفادے اور مختلف علوم میں ان کی تحصیلِ علم پر نظر ڈالتے ہیں تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ لکھنے کے لیے کن علمی اوصاف اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ایک محقق نے لکھا:

"وممَّا يلاحظ أن أبا جعفر تلقَّى العلم في رحلته على معظم علماء عصره وسمع عن الكثير من الشيوخ الثقات أصحاب الأسانيد العالية، وهذا سيكون له الأثر الكبير في تكوين شخصيته، فأصبح إمام عصره، وتصدَّر مجالس العلم بين أقرانه، قال الخطيب البغدادي: "وكان قد جمع من العلوم ما لم يُشاركه فيها أحدٍ من أهل عصره، وكان حافظاً لكتاب الله عارفاً بالقراءات بصيراً بالمعاني، فقيهاً في أحكام القرآن، عالماً بالسنن وطرقها وصحيحها وسقيمها وناسخها ومنسوخها، عارفاً بأقوال الصحابة والتابعين

ومسائل الحلال و الحرام، عارفاً بأيام الناس وأخبارهم." (منهج الطبري في تأليف كتاب تاريخ الرسل والملوك، 25 ذو الحجة 1436ھ، وفيه نقل عن: (الخطيب البغدادي، تـــاريخ بغـداد، دار الكتاب العربي، بيروت، ج2، ص136)

ترجمہ: یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ابو جعفر طبری نے اپنے اسفارِ علمی کے دوران اپنے زمانے کے بیشتر علما سے علم حاصل کیا، اور بہت سے ثقہ اساتذہ سے سماع کیا جو عالی سندوں کے حامل تھے۔ اس کا ان کی شخصیت کی تشکیل پر گہرا اثر پڑا، حتیٰ کہ وہ اپنے عہد کے امام بن گئے اور اپنے ہم عصروں میں علمی مجالس کی صدارت کرنے لگے۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں:

"انھوں نے اتنے علوم جمع کر لیے تھے کہ ان کے زمانے میں کوئی ان کا شریک نہ تھا۔ وہ قرآنِ کریم کے حافظ، قراءات کے ماہر، معانی پر گہری نظر رکھنے والے، احکامِ قرآن میں فقیہ، سنّتوں، ان کے طرق، صحیح وسقیم، ناسخ و منسوخ کے عالم تھے، صحابہ و تابعین کے اقوال، حلال و حرام کے مسائل اور لوگوں کے ایام واخبار سے بھی بخوبی واقف تھے۔"

علامہ طبری نے اپنی کتاب "تاریخ الامم والملوک" کے مقدمے میں اپنی احتیاط پسند اور شفاف منہج کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

" وليعلم الناظر في كتابنا هذا أن اعتمادي في كل ما أحضرتُ ذكره فيه مما شرطت أني راسمه فيه؛ إنما هو على ما رويتُ من الأخبار التي أنا ذاكرها فيه، والآثار التي أنا مُسندها إلى رواتها فيه، دون ما أُدرِك بحجج العقول واستُنبِطَ بفكر النفوس إلا اليسير القليل منه؛ إذ كان العلم بما كان من أخبار الماضين، وما هو كائن من أنباء الحادثين غير واصل إلى من لم يشاهدهم ولم يدرك زمانهم؛ إلا بإخبار المخبرين، ونقل الناقلين، دون الاستخراج بالعقول، والاستنباط بفكر النفوس. فما يكن في كتابي هذا من خبرٍ ذكرناه عن بعض الماضين مما يستنكره قارئه، أو يستشنعه سامعه، من أجل أنه لم يعرف له وجهاً في الصحة، ولا معنى في الحقيقة، فلْيَعلم أنه لم يُؤتَ في ذلك من قِبَلنا، وإنما أُتِي من قِبَل بعض ناقليه إلينا، وأنَّا إنما أدَّينا ذلك على نحو ما أُدِّيَ إلينا." (أبو جعفر محمد بن جرير الطبري، تاريخ الطبري -تاريخ الأمم والملوك، تحقيق محمد أبو افضل إبراهيم، بيروت: دار سويدان، ج1/ ص7-8)

ترجمہ: اس کتاب کو پڑھنے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اس میں جو کچھ ذکر کیا ہے، اس میں میرا اعتماد انھی روایات اور آثار پر ہے جنھیں میں نے ان کے راویوں کے ساتھ نقل کیا ہے، نہ کہ عقل کے مجرد دلائل یا نفسی قیاسات پر، سوائے بہت قلیل امور کے۔ کیوں کہ گزشتہ اقوام کے حالات اور موجودہ واقعات کا علم اُن لوگوں تک، نھوں نے وہ زمانے خود نہیں دیکھے، صرف راویوں کی خبر اور ناقلوں کی روایت کے ذریعے ہی پہنچ سکتا ہے، نہ کہ محض عقلی استخراج اور فکری استنباط سے۔ پس اگر اس کتاب میں کوئی ایسی خبر ہو جو قاری کو ناپسند یا ناقابلِ قبول محسوس ہو، تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں بلکہ اُن راویوں پر ہے جن سے وہ خبر ہم تک پہنچی، اور ہم نے اسے اسی طرح نقل کیا ہے جس طرح ہمیں منتقل کی گئی۔

علامہ طبری کے منہج کی بنیاد "اسناد" پر تھی۔ مؤرخ کا کام روایت نقل کرنا تھا، جب کہ اس کی جانچ پڑتال محقق کے ذمہ ہوتی ہے، اگرچہ یہ جانچ حدیث کے معیار سے کم درجے کی ہوتی ہے۔ اس بارے میں ایک محقق لکھتے ہیں:

" إن الدارس لكتابات مؤرخينا الأوائل يجدها في الغالب تعتمد منهجاً واحداً، إنه الإسناد الذي كان بمثابة الملاذ الذي يلجأ إليه المؤرخ المسلم لتوثيق خَبَرِه من جهة، ولتبرئة ذمته من الخبر إن كان غير صحيح، وتحميل ناقليه مسؤولية صِدْقِه أو كذبه من جهة أخرى، ولقد حاز المسلمون الريادة حين ابتدعوا هذا الأسلوب الذي لم يُعهد من قبل في كتابة الأحداث التاريخية ولم تعرفه أمة من الأمم السابقة أو اللاحقة، وهي ميزة تُحسَب لهم، وهذا يدخل في إطار الإبداع العلمي، و كما هو معلوم فإن التوثيق من الأشياء المطلوبة التي تُضفي على الخبر التاريخي مصداقية أكبر."

http://sadaqua.blogspot.com/2015/10/blog-post_22.html)

ترجمہ: جو شخص ہمارے ابتدائی مؤرخین کی تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے، وہ پاتا ہے کہ وہ عموماً ایک ہی منہج پر قائم تھیں، اور وہ ہے **"اسناد"**۔ یہ اسناد مسلمان مؤرخ کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی تھی، ایک طرف خبر کو مستند بنانے کے لیے، اور دوسری طرف اگر خبر غلط ہو تو اپنی ذمہ داری سے بری ہونے کے لیے اور اس کا بوجھ ناقلین پر ڈالنے کے لیے۔ مسلمانوں نے اس اسلوب میں سبقت حاصل کی، کیوں کہ تاریخ نویسی میں ایسا طریقہ نہ اس سے پہلے کسی قوم نے اختیار کیا اور نہ بعد میں۔ یہ ان کا ایک علمی امتیاز اور تخلیقی کارنامہ ہے، کیوں کہ توثیق تاریخی خبر کو کہیں زیادہ معتبر بنادیتی ہے۔"

اسی محقق نے امام طبری کے بارے میں مزید لکھا:

"وقد جسَّد هذا المعنى مؤرخنا الكبير الإمام أبو جعفر الطبري، فقد أجاد في كتابه التاريخ الإسلامي بالرواية، وإن لم يحكم على ناقليها، فهذا لا يعتبر عيباً في مؤلَّفه [لاسيما وقد نَبَّه هو إلى ذلك]، فَجَمْعه لروايات كثيرة أحياناً قد تكون متناقضة يعتبر عملاً تركيباً ضخماً، ومن أراد تحقيقها قبولاً أو رفضاً فما عليه إلا تتبع أسانيدها والحكم عليها بما تستحق.

لقد ترك الطبري بصمة واضحة في مجال الكتابة التاريخية، ففي أيامه بلغ عِلْمَان أساسيان متقاربان إلى حدٍّ كبير نُضْجَاً كبيراً (علم الحديث) و(التاريخ)، فتدوين الحديث الشريف عُرِفَ عصره الذهبي في القرن الثالث الهجري، والحال كذلك بالنسبة لتدوين التاريخ الذي سَيعْرِف نَقْلَة نوعية مع كتاب الطبري رحمه الله."

http://sadaqua.blogspot.com/2015/10/blog-post_22.html)

ترجمہ: اس مفہوم کو مؤرخ امام ابو جعفر طبری نے عملی صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے تاریخ کو روایات کے ذریعے بہترین انداز میں مرتب کیا، اگرچہ انھوں نے ہر راوی پر حکم نہیں لگایا، اور یہ ان کی کتاب کا نقص نہیں، خصوصاً جب وہ خود اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ بسا اوقات متضاد روایات کو جمع کرنا ایک عظیم ترکیبی کام ہے، اور جو شخص ان روایات کو قبول یا رد کرنا چاہے، اس پر لازم ہے کہ وہ ان کی اسناد کی تحقیق کرے۔ طبری نے تاریخ نویسی میں نمایاں نقوش چھوڑے، ان کے عہد میں دو علوم: (1) حدیث اور (2) تاریخ، اپنی پختگی کو پہنچے۔ جس طرح تیسری صدی ہجری حدیث کی تدوین کا سنہرا دور تھی، اسی طرح اس دور میں تاریخ بھی طبری کی بدولت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔

(جاری)۔□□□

حفظانِ صحت

آسان گھریلو نسخوں سے سرمائی خشکی کا علاج

ڈاکٹر ام فرح۔ ایم. ڈی

سردیاں اپنے دامن میں ٹھنڈی ہوا کی تازگی، نرم و گرم سویٹر، لحاف کی راحت اور دنوں کی سست روی لے کر آتی ہیں۔ یہ موسم بظاہر سکون اور آرام کا پیامبر ہوتا ہے، مگر جیسے ہی سردی کا زور بڑھتا ہے، ہماری جلد خاموش احتجاج شروع کر دیتی ہے۔ گالوں کا کھنچ جانا، نہانے کے بعد ٹانگوں میں خارش، ہونٹوں کا پھٹ جانا اور ایڑیوں کا سخت ہو کر چیخ جانا، یہ سب اس بات کا اعلان ہوتے ہیں کہ جلد اپنی قدرتی نمی کھو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر سردیوں میں جلد اتنی بے چین کیوں ہوتی ہے، اور کیا اس کا علاج مہنگی کریموں اور مصنوعی طریقوں کے بغیر ممکن ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جلد کو اگر ایک دیوار سمجھا جائے تو اس کے خلیے اینٹوں کی مانند ہوتے ہیں اور قدرتی تیل ان کے درمیان سیمنٹ کا کام کرتا ہے۔ سردیوں میں ٹھنڈی اور خشک ہوا اس دیوار سے نمی چرا لیتی ہے، جب کہ گھروں میں استعمال ہونے والے ہیٹر فضا کو مزید بے آب کر دیتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہم عموماً گرم پانی سے غسل کرتے ہیں، جو جلد کے قدرتی تیل کو دھو کر بہا لے جاتے ہیں۔ سردیوں میں جسم خود بھی کم سیبم پیدا کرتا ہے اور چوں کہ پیاس کم لگتی ہے، اس لیے پانی پینے کی مقدار بھی گھٹ جاتی ہے۔ ان سب عوامل کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے: خشک، کھردری، کھجلی زدہ اور بے جان جلد۔

سردیوں میں عام طور پر جو جلدی مسائل سامنے آتے ہیں، ان میں چہرے کی کھنچاؤ بھری کیفیت، نہانے کے بعد ٹانگوں میں شدید خارش، ہونٹوں کا بار بار پھٹ جانا، ایڑیوں کی سختی، ہاتھوں کا کھردرا پن، سر میں خشکی اور بعض اوقات ایگزیما کا ابھر آنا شامل ہیں۔ اگر بروقت توجہ نہ دی جائے تو یہ مسائل محض ظاہری تکلیف نہیں دیتے بلکہ مسلسل اذیت بن جاتے ہیں۔

جلد کی حفاظت کا پہلا اصول نہایت سادہ ہے: نیم گرم پانی سے اور کم وقت کے لیے غسل کیا جائے۔ اگرچہ گرم پانی سردیوں میں بے حد لطف دیتا ہے، مگر یہ جلد کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ مختصر غسل اور صابن فری یا ہلکے کلینزر جلد کی قدرتی حفاظتی تہ کو برقرار رکھتے ہیں۔ غسل کے فوراً بعد، یعنی تین منٹ کے اندر موئسچرائزر لگانا ایک سنہرا اصول ہے۔ اس لمحے جلد میں موجود نمی کو بند کر دینا اسے سارا دن محفوظ رکھتا ہے۔

قدرت نے ہمیں کئی ایسے اجزا عطا کیے ہیں جو جلد کے لیے نہایت مفید ہیں۔ شہد ایک قدرتی ہائیڈریٹر ہے جو جلد میں نمی جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہلکی اینٹی بیکٹیریل خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ ناریل کا خالص تیل جلد پر قدرتی حفاظتی شیلڈ بناتا ہے، خارش کم کرتا ہے اور خشکی کو قابو میں رکھتا ہے۔ اسی طرح تل اور زیتون کا تیل روایتی ہونے کے باوجود آج بھی مؤثر مانے جاتے ہیں، خصوصاً اگر ہلکا سا گرم کر کے استعمال کیے جائیں۔

ہونٹوں کی خشکی سردیوں کا سب سے عام مسئلہ ہے۔ رات کے وقت ہونٹوں پر تھوڑا سا گھی لگا کر اس پر پیٹرولیم جیلی کی تہ چڑھا دی جائے تو صبح تک ہونٹ نرم اور ملائم ہو جاتے ہیں۔ ایڑیوں کی دراروں کے لیے بھی رات کا علاج نہایت سودمند ہے: نیم گرم نمکین پانی میں پاؤں بھگونا، پھر موٹا سا موئسچرائزر لگا کر سوتی موزے پہن لینا چند ہی دنوں میں نمایاں فرق پیدا کر دیتا ہے۔

(باقی ص:41 پر)

چراغ خانہ

بے سہارا عورت اور معاشرتی نیتیں

سلمیٰ شاہین امجدی

ہمارے ملک کا سماج بظاہر ترقی، تعلیم، حقوق اور انصاف کے نعرے بلند کرتا ہے، مگر حقیقت میں وہی صدیوں پرانے جبر، کمزوریوں کا استحصال، اور مجبور انسان کی بے بسی پر مبنی فیصلے آج بھی پوری قوت کے ساتھ زندہ ہیں۔ خصوصًا جب بات بے سہارا عورت کی ہو۔ وہ عورت جو بیوہ ہو، مطلقہ ہو، یا زندگی کے ناموافق حالات میں اکیلی کھڑی ہو۔ تو معاشرہ اس کی کمزوری کو سہارا دینے کے بجائے اکثر اس کے خلاف ہتھیار بنا دیتا ہے۔

یہ مضمون کسی ایک عورت کی کہانی نہیں، بلکہ ہزاروں کی خاموش، مگر بے پناہ درد بھری صدائے عیاں کرتا ہے، جن کی زندگی ایک حادثے یا معاشرتی دباؤ کے بعد درندوں کے سامنے کھلی کتاب بن جاتی ہے۔ ہر دروازے پر انہیں سہارا نہیں بلکہ سودا سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ضرورتوں میں رحم کے بجائے ریٹنگ دیکھی جاتی ہے، ان کی کمزوری میں ہمدردی کے بجائے موقع تلاش کیا جاتا ہے، اور ان کی عزت میں اعتماد کے بجائے شک ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ وہ معاشرتی رویے ہیں جو آج بھی ہمارے سماج کے بدترین چہرے کو ظاہر کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں خواتین کی عزت اور ان کے حقوق کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۙ (سورۃ الانعام 152)

ترجمہ: اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر بہت اچھے طریقے سے جب تک وہ اپنی جوانی کو پہنچے اور ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری کرو ہم کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کے مقدور بھر اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو اگرچہ تمھارے رشتہ دار کا معاملہ ہو اور اللہ ہی کا عہد پورا کرو یہ تمھیں تاکید فرمائی کہ کہیں تم نصیحت مانو۔

یہ نہ صرف یتیم بلکہ بے سہارا اور مظلوم خواتین کے حقوق کی حفاظت کی ہدایت بھی ہے، کہ معاشرہ انھیں استحصال کا شکار نہ بنائے، بلکہ عزت اور انصاف فراہم کرے

آئیے یہ حقیقت تسلیم کریں کہ آج مسئلہ عورت کا نہیں، بلکہ نیتوں کا ہے۔ جس قوم میں کردار کمزور ہو جائے، وہاں عورت کا تحفظ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ ○

(سورہ الاعراف، آیت 85)

ترجمہ: اور لوگوں کی چیزیں گھٹا کر نہ دو۔

لیکن افسوس کہ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ لوٹا جانے والا حق وہ عورت کے ہیں جو بے آسرا ہیں۔ حقِ عزت، حقِ حفاظت، حقِ سہارا، اور حقِ اعتماد۔ آپ نے دیکھا ہوگا: جب ایک بیوہ عورت مالی مدد طلب کرے، فوراً لوگوں کے ذہن میں اس کی نیت پر سوال اٹھنا شروع ہو جاتا ہے، اور اس کی ضرورت کو مشکوک رنگ میں دیکھا جاتا ہے۔

جب ایک مطلقہ عورت مشورہ مانگے، تو معاشرہ اسے علم یا رہنمائی کے بجائے کسی ذاتی خواہش یا کمزوری سے جوڑ دیتا ہے۔

جب کوئی تنہائی کا شکار عورت رہنمائی یا محبت بھرا مشورہ طلب کرے، تو لوگ اسے غلط مفہوم دیتے ہیں اور سمجھتے

بنت نعیم اللہ، ابراہیم پور، اعظم گڑھ

ہیں کہ وہ دوستی یا قربت کی خواہاں ہے۔

یہ کیسا معاشرہ ہے؟ جہاں عورت کے آنسو نظر آتے ہیں، مگر اس کی ضرورت، اس کی عزت، اور اس کی انسانیت پر کوئی غور نہیں ہوتا۔ یہ وہ نیتوں کا فساد ہے جو معاشرتی اخلاق کو تباہ کر دیتا ہے اور عورت کی کمزوری کو ہتھیار نہیں بلکہ موقع بناتا ہے۔

اسلام میں عورت کے حقوق کی حفاظت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّكُمْ تَسْتَحْقِرُونَ نِسَاءَكُمْ، فَاعْلَمُوا أَنَّهُنَّ عَونٌ لَكُمْ وَأَخٌ لَكُمْ فِي الدِّينِ وَأُمٌّ لَكُمْ فِي الأَخْلَاقِ. (جامع ترمذی، حدیث 115)

ترجمہ: اے لوگو! تم اپنی عورتوں کو حقیر مت سمجھو، جان لو کہ وہ تمھارے لیے مددگار، دین میں تمھاری ہم نوا اور اخلاق میں ماں کے برابر ہیں۔

یہ تعلیم واضح کرتی ہے کہ عورت کی عزت اور حقوق پر آنکھیں بند کرنا یا اس کے حق کو نظر انداز کرنا، محض اس کی کمزوری نہیں، بلکہ معاشرے کی اخلاقی و روحانی شکست ہے۔

عملی حالات اور بھارتی سماج کا بدلتا ہوا روپ:

ہمارے ملک ہندوستان میں سماجی ڈھانچہ تیزی سے تبدیل ہوا ہے۔ تعلیم اور ٹیکنالوجی نے ترقی کی راہیں کھولی ہیں، مگر اخلاقی پستی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ بیوہ، مطلقہ یا تنہائی کی زندگی گزارنے والی عورت کے لیے عملی حالات آج بھی انتہائی دشوار ہیں:

ویلفیئر سسٹم کمزور اور ناقابل بھروسا ہے، قانونی مدد تک پہنچنا مشکل ہے، پولیس کا رویہ اکثر سرد اور غیر معاون نظر آتا ہے، خاندان بکھرا ہوا یا غیر محفوظ ہے، پڑوسی بے حس ہیں، شدید معاشی بد حالی ہے، اکیلی عورت کے لیے ہر راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں بے سہارا عورت جیتی ہے۔ گھروں سے دفاتر تک، سرکاری اداروں سے سماجی تنظیموں تک، اسے قدم قدم پر عزت کے بدلے سہولت کا جال دکھایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ زندگی تب ہی آسان بن سکتی ہے جب وہ اپنی حدود بدل دے۔ یہی لمحہ انسانیت کے جنازے کا وقت ہوتا ہے۔

اسلام عورت کا تحفظ کیسے کرتا ہے؟

اسلام نے عورت کو عزت، مقام، حق اور تحفظ دیا۔ جو دین بیٹی کو رحمت کہتا ہے، وہ کبھی عورت کے استحصال کو برداشت نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خَيرُكُمْ خَيرُكُمْ لِنِسَائِهِ. (ترمذی، حدیث 115)

ترجمہ: تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہو۔

اور فرمایا: اتَّقُوا اللهَ فِي النِّسَاءِ. (مسلم، حدیث 365)

ترجمہ: عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔

یہ تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ عورت کے حقوق کی حفاظت کرنا ہر انسان کی ذمہ داری ہے، اور عورت کی کمزوری کو ہتھیار بنانے کا رویہ نہ صرف اسلام بلکہ انسانیت کے بھی خلاف ہے۔ عورت کی کمزوری کو سہارا نہیں، سزا بنایا جاتا ہے

یہ کڑوی حقیقت ہے کہ: بیوہ عورت کو آسان سمجھا جاتا ہے، مطلقہ عورت کو مسئلہ سمجھا جاتا ہے، تنہا عورت کو موقع سمجھا جاتا ہے اور مجبور عورت کو سودا۔ سماج کا یہ رویہ عورت کو صرف تنہا نہیں کرتا، بلکہ اس کی روحانی، ذہنی اور معاشی زندگی کو بھی برباد کر دیتا ہے۔ وہ اعتماد کھو دیتی ہے، لوگوں کے درمیان رہ کر بھی تنہا محسوس کرتی ہے، اور زندگی اسے خوف اور خاموشی میں دھکیل دیتی ہے۔

اسلام میں عورت کے حق میں انصاف اور تحفظ کی اتنی تاکید، اس معاشرتی رویے کی تلخی کو مزید نمایاں کرتی ہے۔ قرآن و حدیث ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ عورت کے ساتھ نرمی، عدل اور ہمدردی سے پیش آنا ہر مومن کا فرض ہے، اور جو معاشرہ اس اصول کو بھول جائے، وہ اخلاقی اور سماجی اعتبار سے اپنی تباہی کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی عزت، جان، مال اور

وقار سب محترم ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَن أَظْلَمَ نِسَاءً فَأَحْشُرُوهُ يَوْمَ القِيامَةِ.

(ابن ماجہ، حدیث 2002)

ترجمہ: جو عورت پر ظلم کرے گا، قیامت کے دن اس کے لیے عذاب ہے۔

یہ تعلیم واضح کرتی ہے کہ عورت کا تحفظ صرف اخلاقی فریضہ نہیں بلکہ شرعی ضرورت بھی ہے۔ ہماری آئینی و سماجی ذمہ داری ہے کہ عورت کو ہر لحاظ سے تحفظ دیا جائے، اس کی کفالت کی جائے، اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے، اسے غلط نظریات اور اذیت کا شکار نہ بنایا جائے۔

کئی عورتیں تو گھر سے باہر نکلنے سے بھی ڈرتی ہیں، کیوں کہ انھیں لگتا ہے کہ معاشرہ ان کی مدد نہیں کرے گا، بلکہ ان کی جانچ کرے گا۔ ان کی زندگی ان کے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہوتی؛ وہ حالات، کرداروں، نظریات، اور معاشرتی خوف کے درمیان بھٹکتی ہوئی ایک سایہ بن جاتی ہیں۔

ایک مضبوط سماج کا آغاز: اگر ہم واقعی تبدیلی چاہتے ہیں، تو تین بنیادی اقدامات ضروری ہے کہ ◘ اپنی ذہنیت بدلیں، عورت کو کمزور نہیں، بلکہ انسان سمجھیں۔ اس کی ضرورت کو جرم یا شک کا سبب نہ بنائیں، بلکہ اس کا حق تسلیم کریں۔ ◘ دینی تعلیم عام کریں کیوں کہ جب تک دل میں خوفِ خدا نہ ہوگا اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات پر عمل نہیں ہوگا، عورت کا حقیقی تحفظ ممکن نہیں۔ ◘ قانونی اور سماجی تحفظات کا دائرہ بڑھایا جائے تاکہ ملک میں خواتین کے لیے سپورٹ سسٹم مضبوط ہو سکے اور وہ اس خوف سے آزاد ہوں کہ مدد مانگنا ان کی عزت پر حملہ بن جائے گا۔

ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہمارا معاشرہ مکمل طور پر اندھیرے میں نہیں ہے۔ جہاں کچھ لوگ عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں، وہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو واقعی سہارا بنتے ہیں۔ تبدیلی ہمیشہ ایک فرد سے شروع ہوتی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص انصاف سے بات کرے، پاک نیت رکھے، کمزور کے لیے ڈھال بنے، عورت کے لیے تحفظ کا ہاتھ بڑھائے تو یہی وہ چراغ ہے جو اندھیروں کو چیر سکتا ہے۔ عورت کے لیے معاشرہ بہتر تب بنے گا جب دل بہتر ہوں گے، اور جب ہر انسان اپنی نیت اور کردار میں بہتری لائے گا۔

----------☆☆☆----------

(ص:38 کا بقیہ) اگر خشکی خارش یا سوزش میں بدل جائے تو دلیے (اوٹس) کا غسل نہایت مفید ثابت ہوتا ہے، خاص طور پر ایگزیما کے مریضوں کے لیے۔ اسی طرح دودھ یا دہی میں موجود لیکٹک ایسڈ جلد کو نرمی سے صاف اور ہائیڈریٹ کرتا ہے، جب کہ ایلوویرا کا خالص جیل سرخی اور جلن کو کم کر کے جلد کو سکون پہنچاتا ہے۔

جلد کی خوبصورتی صرف باہر سے نہیں، اندر سے بھی پروان چڑھتی ہے۔ سردیوں میں اگرچہ پیاس کم لگتی ہے، مگر جسم کو مائعات کی ضرورت برقرار رہتی ہے۔ پانی کے ساتھ ساتھ سوپ، ناریل پانی، چھاچھ اور متوازن چکنائی، جیسے تھوڑا سا گھی اور اومیگا تھری سے بھرپور غذائیں جلد کو اندر سے طاقت دیتی ہیں۔ اسی طرح کمروں میں نمی برقرار رکھنا، اون کے کپڑوں کے نیچے سوتی لباس پہننا اور خوشبودار مصنوعات سے پرہیز کرنا بھی جلد کی حفاظت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

البتہ اگر خشکی اس حد تک بڑھ جائے کہ جلد پھٹ کر خون آنے لگے، شدید خارش یا رساؤ ہو، یا ایگزیما اور سوریاسس جیسی بیماریاں ہو جائیں تو گھریلو تدابیر پر اکتفا کرنے کے بجائے معالج سے رجوع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ماہرین جلد عموماً سیرمائیڈ پر مشتمل موئسچرائزر، خوشبو سے پاک مصنوعات اور رات کے وقت موٹی کریم کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سردیاں اگرچہ جلد کے لیے سخت امتحان ہوتی ہیں، مگر درست عادتوں اور سادہ گھریلو نسخوں کے ذریعے اس امتحان کو آسانی سے جیتا جا سکتا ہے۔ تھوڑی سی توجہ، مستقل مزاجی اور قدرتی طریقوں پر اعتماد آپ کو پورے موسم میں نرم، چمکدار، بے خارش اور صحت مند جلد عطا کر سکتا ہے۔ ◘◘◘

فکر و نظر

نکاح نسل انسانی کی بقا کا ضامن

بزمِ دانش میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں۔ ہم اربابِ قلم اور علماے اسلام کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں۔ از: **مبارک حسین مصباحی**

نکاح میں سادگی

از: **مجیب الرحمٰن ثقافی**، متعلم مرکز ثقافۃ السنیہ الاسلامیہ، کیرلا

یہ بات ہر ذی علم بلا تردد تسلیم کرتا ہے کہ قوم مسلم جس تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے اس کے ذمے دار ہم خود ہیں، ہم نے کفار کے اسراف اور بے جا رسوم و رواج کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا ہے، جس کے نتیجے میں ہم روز بروز زبوں حالی و بربادی کی جانب بڑھتے جا رہے ہیں، بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ ہم رکیں، ہم ان ہی رسموں میں مگن ہو گئے ہیں، ہماری غلطیوں کی فہرست بہت طویل ہے، جن میں سب سے اہم نکاح میں بے جا رسم و رواج اور حد سے زیادہ فضول خرچی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم کی نوجوان نسل تباہی کی طرف گامزن ہے یا اسلام کی شہزادیاں ارتداد کی طرف جا رہی ہیں۔ یقیناً یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہماری معاشرتی تباہی وجہ نوے فیصد یہی غلطیاں ہیں، نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہم اس حقیقت کو دیکھ کر بھی بے خبر ہیں اور تماشائی بنے ہوئے ہیں، ان نازک حالات میں اگر ہم نے ان تمام خرافات کو اپنے معاشرے سے ختم نہ کیا تو ہمارا مستقبل نہایت خطرناک اور مہلک ہو سکتا ہے، پھر ہم صرف اپنے گزرے وقت پر نادم ہوں گے اور خود کو ملامت کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پائیں گے، اس لیے بہتر ہے کہ ہم ان تاریک راستوں پر چلنے سے پہلے اپنے مستقبل کو روشن اور تابناک بنالیں۔

نکاح کیا ہے؟ جیسے انسان کی دیگر فطری ضروریات ہیں، ویسے ہی نکاح بھی انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے، نکاح وہ خوبصورت رشتہ ہے جو مرد اور عورت کو جائز طریقے سے ایک دوسرے کے لیے حلال کرتا ہے اور انہیں ایک مکمل اور باہمی تعلق میں باندھتا ہے، سب سے پہلا جوڑا جو اللہ رب العزت نے نکاح کی شکل میں تخلیق کیا، وہ حضرت سیّدنا آدم علیہ السلام اور حضرت حوا رضی اللہ عنہا کی جوڑی ہے، نکاح ایک عظیم عبادت ہے، جو نسلِ انسانی کے وجود میں آنے اور اس کے تسلسل کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ خدا کے برگزیدہ بندوں کی پیدائش کا سبب ہے اور انسان کے فطری جذبات کو ایک صحیح اور پاکیزہ راستے پر استوار کرتا ہے، نکاح انسان کو بدکاریوں اور گمراہی کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو صراطِ مستقیم کی طرف موڑ دیتا ہے، یہ زانی و زانیہ کے قدموں میں زنجیریں ڈال کر انہیں پاکیزگی کی راہ دکھاتا ہے، نکاح ایک ایسی روشنی ہے جو گمراہی کی تاریکی میں بھٹکے ہوئے انسان کو

راستہ دکھاتی ہے، اور اس کو افعال قبیحہ سے بچا کر اسے ایک محفوظ اور پاکیزہ زندگی کی طرف رہنمائی فراہم کرتی ہے، نکاح مرجھائے ہوئے پھولوں کو گلاب کی مانند مہکنے پر مجبور کر دیتا ہے اور بے رنگ دلوں کو خوشبو سے معمور کرتا ہے، یہ زندگی کی تلخیوں کو خوشگوار بنا کر اسے نسیم سحر کی مانند مفید اور دلکش بناتا ہے۔

نکاح: خیر و برکت کا نزول: نکاح جب شریعت مطہرہ کے بتائے گئے قوانین کی روشنی میں انجام دیا جائے تو اس سے نہ صرف شرم و حیا کا حصول ہوتا ہے بلکہ مال کی فراوانی اور زندگی میں خوشی و سکون بھی آتا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب جامع صغیر (ص98، حدیث: 1567) میں ایک حدیث بیان کی ہے:

"اِلْتَمِسُوا الرِّزْقَ بِالنِّكَاحِ" یعنی نکاح کے ذریعے رزق تلاش کرو۔ حضرت علامہ عبدالرءوف مناوی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "جب شادی کی نیت صاف اور نیک ہو، تو یہ نکاح برکت اور رزق میں وسعت کا سبب بنتا ہے۔" اسی طرح قرآن مجید کی سورہ النور (آیت 32) میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، "ترجمہ: اور نکاح کر دو اپنوں میں ان کا جو بے نکاح ہوں اور اپنے لائق بندوں اور کنیزوں کا اگر وہ فقیر ہوں تو اللہ انہیں غنی کر دے گا اپنے فضل کے سبب اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔" اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نکاح کا عمل نہ صرف فرد کی روحانی اور معاشی حالت میں بہتری لاتا ہے بلکہ اللہ کی رضا اور برکت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

قرآن کریم معاشرے کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی بھی فرد چاہے مرد ہو یا عورت، بغیر نکاح کے نہ رہے۔ نکاح نہ صرف ایک سماجی فریضہ ہے بلکہ افراد اور معاشرے کی خوشحالی اور سکون کے لیے بے حد ضروری ہے۔

نکاح کے بنیادی مقاصد:

اخلاق کی حفاظت: نکاح کا سب سے اہم مقصد معاشرے کے ہر فرد کو با اخلاق اور مہذب بنانا اور اسے برائیوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ یہ سماج کو گناہ اور بے حیائی کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کا ذریعہ ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کی ذمہ داری اٹھانے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ ضرور شادی کرے۔ اس سے نظر کی حفاظت ہوتی ہے اور انسان پاک دامن رہتا ہے۔ اور جو اس کی استطاعت نہ رکھے، وہ روزے رکھے، کیونکہ روزہ شہوانی جذبات کو کمزور کر دیتا ہے۔" اکابرین فرماتے ہیں کہ ایک غیر شادی شدہ شخص ہر وقت شیطان کے نرغے میں رہتا ہے۔ جوانی کا فطری تقاضا ذہنی سکون اور جذبات کی تسکین ہے، جو نکاح کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اگر نکاح کی سہولت میسر نہ ہو تو شیطان انسان کو بہکا کر خیالات اور جذبات کو غلط راستوں پر ڈال دیتا ہے، آج کے دور میں جہاں ہر جانب جذبات کو بہکانے اور بھڑکانے کے وسائل موجود ہیں، نکاح کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ نہ صرف ایک فرد کی حفاظت کا ذریعہ ہے بلکہ پورے معاشرے کو پاکیزگی اور امن کا گہوارہ بنانے کا ایک بہترین سامان ہے۔

سکون و راحت کا حصول: نکاح کا دوسرا اہم مقصد زندگی میں سکون اور راحت کا حصول ہے، زندگی مسلسل محنت اور مشقت کا نام ہے، انسان دن بھر رزقِ حلال کے لیے ملازمت، تجارت، یا دیگر ذمہ داریوں میں مصروف رہتا ہے اور تھک کر چور ہو جاتا ہے، اسی طرح عورت بھی گھر کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے جسمانی اور ذہنی طور پر تھکن محسوس کرتی ہے، ایسے میں دونوں کو آرام اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے جہاں نیند کو تھکن دور کرنے کا ذریعہ بنایا ہے تاکہ انسان اگلے دن کے لیے تازہ دم ہو کر اپنی جدوجہد جاری رکھ سکے، وہیں عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے لیے سکون اور راحت کا سبب بنایا ہے، اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف، آیت 189 میں

فرمایا: "وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس سے سکون پائے۔"

یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، ان کا رشتہ محبت، سکون، اور باہمی تعاون پر مبنی ہے، جو انہیں زندگی کی سختیوں کے باوجود خوشی اور اطمینان فراہم کرتا ہے۔

نسلِ انسانی کو پھیلانے کا ذریعہ: اللہ رب العزت نے حضرت آدم اور حضرت حوا رضی اللہ عنہا کو پیدا کیا اور انہی سے نسلِ انسانی کا آغاز کیا، یہ رشتہ نسلِ انسانی کے تسلسل کو قائم رکھنے اور دنیا کو آباد کرنے کا ذریعہ ہے، نکاح انسانیت کی بقا اور فروغ کا ایک فطری نظام ہے، جسے دینِ اسلام نے پسند کیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔

رسول اکرم ﷺ نے نکاح کے ذریعے اولاد کی کثرت کو پسند فرمایا اور اس کی ترغیب دی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورتوں سے نکاح کرو، تاکہ قیامت کے دن میں دوسری امتوں کے مقابلے میں تمھاری کثرت پر فخر کر سکوں۔"

تاہم، افسوس کی بات ہے کہ آج مسلمان غیر ضروری پروپیگنڈے اور خاندانی منصوبہ بندی جیسی خوبصورت مگر دھوکہ دہ اصطلاحات سے متاثر ہو چکے ہیں، یہ خیالات قدرت کے فطری نظام کو چیلنج کرتے ہیں اور امت مسلمہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کمزور کرنے کی سازش کا حصہ ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں عقلِ سلیم عطا فرمائے تاکہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں اور نسلِ انسانی کے فروغ میں اپنی مثبت کردار ادا کر سکیں۔

شریکِ زندگی، شریکِ مقصد: نکاح کا چوتھا اور سب سے اہم مقصد زندگی کے مقصد میں ایک دوسرے کی شرکت اور مدد ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مقصد اپنی عبادت قرار دیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: 56)

مرد اور عورت دونوں کا مقصد زندگی اللہ کی عبادت ہے، اور جب وہ ایک دوسرے کے شریکِ حیات بن جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کے شریکِ مقصد بھی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھی بن کر بندگی کے اس عظیم مقصد کو پورا کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ کی آیت 71 میں فرمایا: "اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا رحم نازل ہوگا۔ بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔"

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی زندگیوں میں بھی یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنی شریک حیات سے بھرپور تعاون حاصل کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی سارہ و ہاجرہ اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں، جو ہر آزمائش میں ایک دوسرے کے ساتھ تھے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں حضرت خدیجہؓ کا کردار بھی بے مثال ہے، جنہوں نے ہر مشکل وقت میں نبی ﷺ کا حوصلہ بڑھایا، مال و دولت سے مدد کی اور ہر اعتبار سے تعاون فراہم کیا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ زندگی کے مقصد کی تکمیل میں تعاون و مدد کا بہت اہم کردار ہے، اور یہ تعاون صرف نکاح کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ شادی صرف لذت و تفریح کا ذریعہ نہیں، بلکہ یہ اخلاق کی حفاظت، سکون و راحت کی حصول، نسل انسانی کے تسلسل اور ایک دوسرے کی مدد کے ذریعے زندگی کے مقصد کو پورا کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

آخر کار ان برائیوں کا حل کیا ہے؟ آپ کے ذہن میں یہ سوالات اٹھ رہے ہوں گے کہ آخر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کے ضمن میں میں اپنی ذاتی رائے پیش کرنا چاہوں گا، اور مجھے امید ہے کہ یہ ہماری رہنمائی کا باعث بنے گی۔ ہمیں نئے جوش و

خروش کے ساتھ میدان عمل میں اترنا ہوگا اور عوام الناس کو ان تمام امور سے آگاہ کرنا ہوگا تاکہ وہ نکاح کو آسان بنانے کے لیے آمادہ ہوں۔

ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ مستقبل میں اپنی جملہ شادی کی تقریبات کا اہتمام امن و سادگی کے ساتھ ہی کریں گے اور لوگوں کو یہ تعلیم دیں گے کہ لڑکی والوں پر بوجھ ڈالنا درست نہیں، اور ہمیں فضول رسم و رواج سے اجتناب کرنا ہوگا لہٰذا نکاح کی تقریب مسجد میں سادگی سے منعقد کرنی چاہیے، ولیمہ بھی اپنی استطاعت کے مطابق ہی کیا جائے، تاکہ نام و نمود کے پیچھے جانے کی بجائے ایک خوشحال اور پر سکون زندگی کا آغاز ہو،

اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنا گناہ ہے، اگر ہم دو افراد کی نئی زندگی کے آغاز پر ان کو اسلام کے اصولوں کے مطابق رہنمائی فراہم کریں تو ان کی زندگی کامیاب اور خوشحال ہو سکتی ہے، ہمیں فضول اشیاء کو ترک کرکے ایک سنہری زندگی کی بنیاد رکھنی چاہیے۔

آئیے ہم سب عہد کریں کہ نکاح کو سادگی کے ساتھ کریں گے، تاکہ نہ صرف ہمارا معاشرہ بہتر ہو بلکہ ہماری زندگی بھی سکون اور خوشی سے بھرپور ہو۔ اگر ہم ان باتوں کو لوگوں تک پہنچائیں گے تو انشاءاللہ کامیابی حاصل ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نکاح کے معاملے میں فضول خرچی اور بے جا رسم و رواج سے بچائے، اور ہمیں دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق سادگی اور پاکیزگی کے ساتھ نکاح کرنے کی توفیق دے۔ آمین یارب العالمین۔

■■■■■

نکاح اور نسل انسانی کی بقا

از: محمد اشفاق عالم امجدی، بچباری آباد پور کٹیہار (بہار)-7866936010

آدم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو مسجودِ ملائکہ بنایا، تو ان کی تنہائی کو دور کرنے اور نوعِ بشر کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے حضرت حوّا علیہا السلام کو ان کا قرینِ حیات بنا کر یہ آسمانی منشور صادر فرما دیا کہ انسانی معاشرے کی بقا، تہذیبی ارتقا اور تمدنی استحکام کا حقیقی محور "نکاح" جیسا پاکیزہ، بابرکت اور ربانی نظام ہے۔

نکاح در حقیقت فقط حیوانی جبلّت کی تسکین یا نفسانی خواہشات کی تکمیل نہیں بلکہ یہ ایک الٰہی معاہدہ، نورانی میثاق، اور ربانی حکمتوں سے معمور ایسا مقدّس بندھن ہے، جو انسان کو عفت، طہارت، قلبی سکون اور سماجی وقار عطا کرتا ہے۔ اسی عہدِ مقدّس سے نسلِ انسانی کا ارتقائی سفر شروع ہوا، خاندانی نظام کی بنیاد پڑی، اور حیاتِ انسانی کو روحانی رفعت، اخلاقی تحفظ اور تمدنی توازن میسر آیا۔

نکاح-فطرت کی آواز:

انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ اسے اطمینانِ قلب، محبت، انسیت، قربت اور سہارا درکار ہوتا ہے۔ یہ تمام جذبات صرف نکاح کے مقدس رشتے میں ہی مکمل طور پر پروان چڑھ سکتے ہیں۔ اگر انسانی فطرت کو نکاح سے محروم رکھا جائے، تو یہی جذبات بے راہ روی، جنسی انارکی اور اخلاقی انحطاط کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اللہ ربّ العزت نے نکاح کو نہ صرف حلال و پاکیزہ ذریعۂ تسکین بنایا بلکہ اسے ذریعۂ عبادت بھی قرار دیا۔

نکاح-ایمان کی تکمیل:

نکاح دینِ اسلام میں نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فمن لم يعمل بسُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي" "یعنی نکاح میری سنت

ہے، اور جو میری سنت سے منہ موڑے، وہ مجھ سے نہیں۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

"مَنْ تَزَوَّجَ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الإِيمَانِ" یعنی جس نے نکاح کیا، اس نے اپنا آدھا ایمان مکمل کر لیا۔

اور فرمایا: "مَنْ تَرَكَ التَّزْوِيجَ مَخَافَةَ الْعَيْلَةِ، فَلَيْسَ مِنَّا" یعنی جو کوئی تنگ دستی کے خوف سے نکاح کو ترک کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"لا يَتِمُّ نُسُكُ النَّاسِكِ حتّى يَتَزَوَّجَ" یعنی عابد کی عبادت اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک وہ نکاح نہ کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

"لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنْ أَجَلِي إِلَّا عَشَرَةُ أَيَّام، وَأَعْلَمُ أَنِّي أَمُوتُ فِي آخِرِهَا، وَلِي طَوْلُ النِّكَاحِ فِيهِنَّ، لَتَزَوَّجْتُ مَخَافَةَ الْفِتْنَةِ."

اگر میری زندگی میں صرف دس دن باقی ہوں، اور میں جانتا ہوں کہ آخری دن وفات ہے، اور ان دنوں میں نکاح کی قدرت ہو، تو میں فتنے سے بچنے کے لیے نکاح ضرور کروں گا۔

یہ تمام احادیث و اقوال اس حقیقت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں کہ نکاح نہ صرف ایک فطری تقاضا ہے بلکہ ایمان، عبادت اور روحانی و معاشرتی پاکیزگی کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے، جو انسان کو فتنے سے محفوظ رکھتا ہے۔

نکاح-نسلوں کی بقا اور تحفظ:

اگر نکاح کو پسِ پشت ڈال دیا جائے، تو نسلِ انسانی اخلاقی انارکی، بے ترتیبی اور خاندانی انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ مغربی معاشرہ اس کی زندہ مثال ہے، جہاں نکاح کی اہمیت کو فراموش کر دیا گیا، اور آج وہاں کے معاشرتی ڈھانچے بکھر چکے ہیں۔ بچوں کو والدین کا علم نہیں، خاندانی نظام کا تصور مٹ چکا ہے، اور معاشرتی اقدار مٹی میں مل چکی ہیں۔

اس کے برعکس، اسلام نے نکاح کو ہر مرد و عورت کی فطری، اخلاقی اور قانونی ضرورت قرار دے کر انسانیت کو تحفظ دیا، اور نسلِ انسانی کی بقا کے لیے ایک پاکیزہ، باعزت اور مضبوط نظام قائم کیا۔

نکاح ہی وہ مضبوط قلعہ ہے جو زنا، فحاشی، بے حیائی اور اخلاقی تباہی جیسے خطرناک فتنوں کا راستہ بند کرتا ہے۔ جب نکاح کو آسان اور عام بنایا جائے گا، تو بے راہ روی خود بخود ختم ہونے لگے گی۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نکاح کے اس عظیم فریضے کو آسان بنائیں، غیر شرعی رسومات اور مہنگے مطالبات ختم کریں، تاکہ نوجوان نسل حلال راستے کو اپنانے میں جھجک محسوس نہ کرے۔

نکاح-وقت کا اہم ترین تقاضا:

آج کا نوجوان موبائل، سوشل میڈیا اور آزادانہ ماحول میں بے راہ روی کا شکار ہو رہا ہے۔ مجازی محبت، ناجائز تعلقات اور وقتی تسکین کے چکر میں وہ اپنی عزت، وقت، تعلیم، دین اور مستقبل سب کچھ داؤ پر لگا بیٹھتا ہے۔ ایسے میں والدین، اساتذہ اور علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ نوجوانوں کو نکاح کی طرف راغب کریں اور ان کے لیے اس راہ کو آسان سے آسان تر بنائیں۔

نکاح نسلِ انسانی کی بقا، معاشرتی استحکام، روحانی سکون اور اخلاقی تحفظ کی ضمانت ہے۔ جو قومیں نکاح کو اپناتی ہیں، وہ عفت و طہارت کی راہوں پر چلتی ہیں، اور جو اسے نظر انداز کرتی ہیں، وہ تباہی، انتشار اور بربادی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

آیئے! نکاح کو آسان بنائیں، اس عظیم سنت کو زندہ کریں، اور اپنی نسلوں کو زنا، فتنہ اور فساد سے محفوظ رکھیں۔

■■■■■■

گوشۂ ادب

مفتی شمیم القادری کی نعتیہ شاعری

محمد قمر الزماں مصباحی

اصنافِ شاعری میں نعت نگاری بہت ہی لطیف اور نازک ترین صنف ہے۔ اس راہ میں جہاں قدم قدم پر سعادتوں کی خیرات بٹتی ہے۔ وہیں تھوڑی سی کج فکری اور قلمی ذلت حبط ایمان کا باعث ہے۔

نعت گوئی کے لیے ذوقِ سلیم اور فکرِ مستقیم کے ساتھ شریعت کی پاسداری، قرآن و حدیث کا علم اور عشقِ رسالت کا سرمایہ لازم ہے۔ نعت کا محور محبت رسول ہے اور محبت کسبی نہیں وہبی ہوتی ہے۔ جو سب کے تقدیر کی زینت نہیں بنتی یہ توفیضان الٰہی اور توفیق ایزدی کی بات ہے وہ جسے اس گوہر گراں مایہ سے نواز دے۔ جب عشق چٹکیاں لیتا ہے اور فکر کی دہلیز پر جب محبت کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے دل کا درد نغمہ بن کر شعر کی صورت میں گونجنے لگتا ہے۔ اور اسی شعر کو قبولیت کی معراج نصیب ہوتی ہے جو درد و سوز سے بھرا ہو اور جس میں غم ہجراں کی تپش اور فراق یار کی سوزش ہو۔ کیونکہ جس شعر سے محبت کی دھڑکن اور عشق کا زیر و بم سنائی نہ دے اسے طبیعت کی موزونی تو کہہ سکتے ہیں مگر شعر نہیں۔

نظم کی صورت میں نعت نگاری کی روایت آقائے کائنات حضور رحمت عالم ﷺ کی ولادت کریمہ سے ایک ہزار سال پرانی ہے جس کی بنیاد حضرت تبع حمیری رکھی تھی۔ ان کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اپنے اپنے طور پر نبی محترم ﷺ کی بارگاہ میں مدح و نعت کے گلدستے پیش کرتے رہے ہیں۔ جن میں حضرت حسان بن ثابت اور حضرت کعب بن زہیر اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو میر کارواں کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ لسانی اعتبار سے صنف نعت کو جس قدر عروج نصیب ہوا دوسرے اصناف سخن کا دامن اس سے خالی ہے۔ نعت کا یہ ادبی سفر جس طرح بانکپن، لطافت و نزاکت، رعنائی و شگفتگی اور دلبری و دلکشی کے ساتھ شروع ہوا تھا اسی رنگ و آہنگ، رفعت و بلندی اور طہارت فکر کے ساتھ اب بھی مصروف سفر ہے۔

حضرت شمیم القادری اہل سنت و جماعت کے ممتاز عالم دین، زبان و ادب کے ماہر رئیس الاساتذہ اور ادارہ شرعیہ مظفر پور کے قاضی ہیں۔ قدرت نے سنجیدہ فکر، ادبی ذوق، لسانی لطافت اور پاکیزہ قلب و دماغ سے بھی نوازا ہے۔ اتناسب کچھ ہونے کے باوجود نہایت خلیق، خوردہ نواز، ملنسار اور تواضع کے پیکر ہیں۔ مروت و فیاضی اور شرافت و رواداری ان کی کتاب زندگی کا روشن ورق ہے۔ ایک عرصے سے افق شاعری پر آفتاب بن کر چمک رہے ہیں اور فکر و آگہی کا نور بن کر شعر و ادب کے ایوان میں جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں۔ آپ کے قلمی بانکپن اور بلند خیالی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ مظفر پور کے شعرا میں انفرادی شان اور جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں آپ نے شعر و سخن کی جبیں پر ایسے ایسے ستارے ٹانکے ہیں جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کہ پھلوں کے رخسار پر شبنم کے چھینٹے۔ آقائے کونین ﷺ سے والہانہ محبت کی ضامن اور جمالیاتی فکر کا اہم عنصر ہے۔ لفظوں کے صوتی حسن اور معنوی سوز سے

القلم فاؤنڈیشن مظفر پور بہار۔

پوری طرح واقف ہیں۔ آپ کا فکری شعور اور فنی تنگ و دو ہر لمحہ ایک نئی راہ گزر کی تلاش میں مصروف ہے۔ آپ کے اشعار میں وہ سب کچھ ہے جو اچھی شاعری کو درکار ہے۔ پاکیزہ تخیل کا شباب، کوثر و تسلیم میں دھلی دھلائی زبان، حکایت حسن، وجد و کیف، جدت طرازی، روایت کی پاس داری، لب و لہجے کی ندرت، تغزل کا جمال، عشق کی سوزش، نوائے دل، سوز و گداز اور تاثیر کی ایک کائنات آباد ہے۔

میری بزم تصور کس قدر آباد رہتی ہے
تیری یادوں کے صدقے میں کبھی تنہا نہیں ہوتا
محسوس ہو رہا ہے کہ جنت میں آگئے
ان کی گلی کی آب و ہوا کچھ نہ پوچھئے

کتنی سادگی و پرکاری ہے اس شعر میں لیکن تغزل کا رنگ بھی اور ادب کا وقار بھی، فکر کی شوکت بھی ہے اور خیال کی رنگینی بھی۔ جلوؤں کا ہجوم بھی ہے اور یادوں کا تسلسل بھی۔

حضرت شمیم القادری کی فکری نزاکت اپنے قاری سے بار بار خراج عقیدت وصال کرنا چاہتی ہے۔ نئی ردیفوں میں بھی انھوں نے بڑے خوبصورت پھول کھلائے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ فن کی عظمت مجروح ہو رہی ہو یا کوئی شعری سقم نے راہ لے لی ہو۔ بلکہ پورا کلام اپنے دامن میں فن کی ساری بہاریں سنبھالے ہوئے ہے۔

اے رحمت تمام شہنشاہ دو جہاں
جب سے ملا ہے آپ کا غم خیریت سے ہوں
جلوے سمٹ گئے ہیں مکمل وجود میں
دیکھا ہے جب سے نقش قدم خیریت سے ہوں

ایک انوکھی زمین پر انھوں نے نعت کہی ہے جو بڑی کامیاب اور فن کی مکمل دلبری سنبھالے ہوئے ہے۔ پڑھیں گے تو وجدان جھوم اٹھے گا۔ اور اثبات میں نفی اور نفی میں اثبات کی لذت ملے گی۔

سرکار کو صرف ایک بشر ماننے والے
دل میں ترے اللہ کا ڈر ہے کہ نہیں ہے

شمیم القادری دنیاے شاعری کے اس معتبر شخصیت کا نام ہے جس نے شعر و سخن کی زلف برہم سنوارنے میں بڑا کلیدی رول ادا کیا ہے۔ لیکن اسے وقت کا زبردست المیہ کہیے کہ ان کی فکر کا اجالا اور فن کی تجلی بہار و بنگال کے چند اضلاع سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جب کہ ان کے کلام کے مطالعہ سے ہر منصف مزاج یہ فیصلہ کرے گا کہ ان کے ادب کی خوشبو آفاقی ہے جسے بہار و بنگال کی سرحد تک محصور کرنا ان کے فن کے ساتھ ظلم ہے۔

انھوں نے اپنے ذوق ادب اور بلندی خیال کے ذریعے نعت مقدس کی جو خدمت کی ہے اس حوالے سے انھیں ایوارڈ پیش کیا جانا چاہیے۔ ان کی شوکت فکر کے آستانے پر سجود و نیاز لٹانا چاہیے۔ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کسی بھی اہل فن کے ساتھ سوتیلا پن خود ادب کے ساتھ بھیانک مزاق ہے۔ آج بھی بہت سی علمی ہستیاں ایسی ہیں جن کا قلمی سرمایہ دیمک کی نذر ہو رہا ہے اور مایوسی کی دھول اس پر جمتی جا رہی ہے اس کی واحد وجہ وسائل کی کمی اور اسباب کا فقدان ہے۔

مظفر پور اپنی تہذیب و ثقافت، زبان و ادب، صنعت و حرفت اور تعلیمی و لسانی اعتبار سے پورے بہار میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ یہاں کی خاک سے نابغۂ روزگار اور نازش باغ و بہار شخصیتیں ابھریں۔ لیکن آج تاریخ کے پردے پر ان کی عظمتوں کا کوئی نقش محفوظ نہیں ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قرطاس و قلم سے ہم نے آنکھیں موندلی ہیں۔

مفتی صاحب بفضلہ تعالیٰ آج بھی ادارہ شرعیہ مظفر پور کے قضا کے منصب پر فائز المرام ہیں اور ملت کی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوار رہے ہیں نیز اپنے آقا ﷺ کی مدحت سرائی میں مصروف ہیں۔ مولا کریم ان کے قلمی فیضان سے کشت سنیت کو لالہ زار بنائے۔ آمین ثم آمین۔ ◘◘

نقدونظر

خانوادۂ رضا کی علمی و ادبی جہتیں

تبصرہ نگار: مولانا شاھد رضا نعمانی مصباحی

نام کتاب	:	خانوادۂ رضا کی علمی و ادبی جہتیں
مصنف	:	مفتی محمد توفیق احسن برکاتی مصباحی [استاذ: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ]
صفحات	:	160۔ اشاعت: 2022ء
ناشر	:	صراط پبلی کیشنز، مرادآباد، یوپی

سرزمین ہند کا وہ خطہ جسے تاریخ "بریلی" کے نام سے پہچانتی ہے، محض ایک جغرافیائی وجود نہیں بلکہ تیرہویں صدی کے فکری و روحانی افق پر ابھرنے والا وہ "مطلع انوار" ہے جس کی خاک کے ذروں نے بھی ستاروں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی۔ یہ وہ دیارِ شوق ہے جہاں سے اٹھنے والی علم کی لہروں نے نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام کے خشک و تر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اسی زرخیز زمین کی کوکھ سے وہ "خانوادۂ رضویہ" نمودار ہوا جس کے وجودِ مسعود سے علم و فن کے گیسو سنور گئے اور جس کی نکہت فکر نے دین و دنیا کے ہر گوشے کو معطر کر دیا۔ یہ خانوادہ محض افراد کا اجتماع نہیں، بلکہ ایک ایسی علمی کہکشاں ہے جس کا ہر ستارہ اپنی جگہ ایک سورج کی مانند روشن اور تابندہ ہے۔

اس سلسلۂ زریں کی بنیادوں میں مجاہد آزادی حضرت مفتی رضا علی خاں رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جذبۂ صادق کارفرما ہے جس نے آنے والی نسلوں کے لیے غیرتِ دینی اور بصیرتِ علمی کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا کہ جسے زمانہ رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پھر اسی شجر سایہ دار کی سب سے توانا اور قدآور شاخ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی کی صورت میں ظاہر ہوئی جنھوں نے علم کے ہر دشت کو اپنے قلم کی روانی سے گلستان بنا دیا۔ ان کے بعد یہ فیضانِ نظر رکا نہیں، بلکہ حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا قادری، مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا نوری، مولانا حسنین رضا اور پھر ریحانِ ملت سے لے کر تاج الشریعہ اور دیگر اساطین علم و فضل تک ہر عہد میں ایک نئے آب و تاب کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔ ان نفوسِ قدسیہ نے نہ صرف مسند تدریس کو وقار بخشا بلکہ میدانِ صحافت ہو یا وادیِ سیاست، اصلاحِ معاشرہ ہو یا نعتیہ ادب کا نازک سفر؛ ہر موڑ پر اپنی قیادت کے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ اس مقدس اور تاریخی گھرانے کی علمی، ادبی اور شعری خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ اس کا احاطہ کرنا جوے شیر لانے سے کم نہیں۔ ان کی تحریروں میں جو فکری گہرائی، استدلال کی جو پختگی اور زبان کا جو بانکپن ملتا ہے وہ اردو ادب کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

اسی عظیم اور تابندہ ورثے کی جھلک دکھانے اور اس خانوادۂ علم و فضل کے کارناموں کا حق ادا کرنے کے لیے میرے مکرم و محترم استاذ، ادیب لبیب حضرت مولانا مفتی محمد توفیق احسن برکاتی مصباحی [استاذ: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور] نے گراں قدر کتاب "خانوادۂ رضا کی علمی و ادبی جہتیں" تصنیف فرما کر علمی دنیا کو ایک بیش بہا تحفہ عطا کیا ہے۔ مصنف نے عقیدت کی حرارت اور تحقیق کی ٹھنڈی روشنی کو یکجا کر کے جس عرق ریزی، محنت اور دیانت کے ساتھ خانوادۂ رضا کے علمی نوادرات کو سمیٹا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کتاب محض الفاظ کا انبار نہیں، بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بریلی کے اس علمی تاج محل کا عکس پوری

رعنائی، پوری شوکت اور پوری معنویت کے ساتھ جھلملاتا ہے اور اہل ذوق کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔

خانوادۂ رضا کی علمی و ادبی روایت کو اگر ایک منظم، مستند اور محققانہ سانچے میں دیکھنا ہو تو زیر نظر کتاب اپنے مزاج، اسلوب اور داخلی ترتیب کے اعتبار سے ایک مکمل نقشہ پیش کرتی ہے۔ مصنف نے محض جذباتی عقیدت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک سنجیدہ اکیڈمک منہج کے ساتھ پورے خانوادے کی علمی جہات کو مرتب کیا ہے؛ اس ترتیب میں سوانح، تذکرہ، تحلیل اور تنقیدی اشارات سب کچھ نہایت نفاست کے ساتھ ایک ہی بیانی بہاؤ میں گندھے ہوئے ہیں۔ کتاب کا مرکزی امتیاز یہ ہے کہ اس میں خانوادۂ رضا کی تیرہ ممتاز شخصیات کو منتخب کر کے ان کی حیات و خدمات کو تفصیلی اور تحقیقی پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر شخصیت کے تحت صرف مختصر تعارف پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان کے علمی مقام، فکری خدمات، تدریسی و تصنیفی آثار بالخصوص ادبی ذوق و اسلوب کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے؛ یوں ہر مقالہ ایک مستقل مطالعہ اور مکمل تحقیقی خاکہ بن کر سامنے آتا ہے۔ فہرستِ مضامین سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے امام احمد رضا قادری کے جد امجد مفتی رضا علی خان سے آغاز کر کے ان کے بعد آنے والی مختلف نسلوں کی چنیدہ ہستیوں تک ایک فکری ربط قائم رکھا ہے؛ اس ربط میں نسبتِ رضا، علمی وراثت، دینی خدمت اور ادبی ذوق سب کو ایک ہی سلسلۂ معنویت کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ہر مقالہ نہ صرف متعلقہ شخصیت کے عہد اور ماحول کی جھلک دکھاتا ہے بلکہ اس کے اثرات کو معاصر علمی و ادبی فضا پر بھی پرکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس سے کتاب کا مزاج محض تذکرہ نہیں رہتا بلکہ تحقیقی و تنقیدی سطح تک بلند ہو جاتا ہے۔ یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس انداز سے ان تیرہ شخصیات کا انتخاب ہوا ہے، اس میں خانوادۂ رضا کی داخلی تنوع پسندی نمایاں ہوتی ہے؛ کہیں فقہ و فتویٰ کے دروبست زیر بحث آتے ہیں، کہیں تفسیر و حدیث کا ذوق کارفرما ہے، کہیں مسلکی و اعتقادی دفاع کی خدمات سامنے آتی ہیں، اور کہیں نعت و نظم، خطابت و نثر، اور ادبی اسلوب آفاقی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح قاری کو پورے خانوادے کی علمی و ادبی تصویر ایک ہمہ جہت، متوازن اور مربوط پیکر میں نظر آتی ہے، جس میں ہر شخصیت اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ مجموعی رضوی روایت کا حصہ بھی معلوم ہوتی ہے۔

خانوادۂ رضا کی علمی و ادبی روایت پر یہ وقیع تالیف اپنے مصنف کے علمی ذوق، تحقیقی مزاج اور فکری تربیت کا نہایت روشن ثبوت ہے۔ مصنفِ محترم استادِ گرامی مفتی محمد توفیق احسن برکاتی مصباحی اُن کہنہ مشق اہل قلم میں سے ہیں جن کے لیے تحریر محض اظہار نہیں، امانت اور ذمہ داری ہے۔ تقریباً دو درجن کے قریب مستقل کتابیں، متعدّد رسائل اور سینکڑوں مضامین و مقالات ان کے قلم سے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں اور علمی و ادبی حلقوں میں قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں۔ بے شمار تبصراتی تحریریں، اداریے اور کئی درجن تقاریظ ان کے سوا ہیں۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور جیسے معتبر ادارے میں طویل عرصے سے بحیثیت متحرک، فعال اور باوقار مدرس خدمت انجام دے رہے ہیں۔ درس گاہ میں بھی اور درس گاہ سے باہر بھی ان کی شخصیت شفقت، سنجیدگی، نفاستِ طبع اور خلوصِ نیت کا مجموعہ محسوس ہوتی ہے؛ علمی مجلس ہو یا غیر رسمی نشست، ان کی گفتگو میں ایک ساتھ تحقیق کی گہرائی، ادب کا زور اور دعوت کی نرمی جھلکتی ہے۔ اساتذۂ راسخین کی صحبت، کلاسیکی متون کی گہری ممارست، اور مسلسل مطالعہ نے ان کی نثر کو ایک خاص وقار اور تہذیبی رچاؤ عطا کیا ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں تو جملہ سازی میں توازن، استدلال میں ترتیب اور اسلوب میں شائستگی نمایاں رہتی ہے، مبالغہ اور خطابی شور کے بجائے استدلالی سکون اور فکری سنجیدگی ان کی شناخت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نعتیہ و نظمیہ شاعری میں بھی ان کا رنگ اپنی جگہ مسلم ہے، ان کے مجموعۂ کلام نے اہل ذوق میں انھیں ایک منفرد شاعر کے طور پر منوایا ہے، جس میں عقیدت اور فکری شعور ساتھ ساتھ چلتے ہیں، نہ صرف جذباتی وابستگی بلکہ فکری مکاشفہ بھی قاری کو حاصل ہوتا ہے۔ شخصی سطح پر ان کے افکار و خیالات سے جو حضرات براہِ راست مستفید ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ درس گاہ میں کبھی کبھی جب وہ محض استاد نہیں

ایک وفا پیشہ مدبر کے طور پر بولتے ہیں تو نصاب کے ورقوں سے آگے نکل کر تاریخ، تہذیب، سیاست، سماج اور روحانیت سب پر اتنے متوازن اور عمیق اشارات دیتے ہیں کہ سامع کے لیے وہ لمحے محض لیکچر نہیں، فکری تجربہ بن جاتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کے اسلوب کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے عمومی تحقیقی منہج کو یہاں نہایت شعوری طور پر برتا ہے۔ کتاب کا بیانیہ ایک رواں، شستہ اور ادبی نثر میں قائم ہے، مگر اس سطح کی ادبی شگفتگی کے باوجود استنادی سختی، حوالہ جاتی احتیاط اور ماخذ کی متابعت میں کوئی کمی نہیں آنے دی؛ ہر اہم دعویٰ کے عقب میں متعدّد مستند حوالہ جات درج کیے گئے ہیں، کہیں کہیں ایک ایک نکتے کے لیے کئی کئی ماخذ پیش کر کے قاری کے لیے تحقیق کی راہوں کو کھول دیا گیا ہے۔ مصادر و مراجع کی فہرست سے لے کر حواشی و تعلیقات تک مصنف کی عرق ریزی، صبر آزما تتبع اور محنتِ شاقہ صاف محسوس ہوتی ہے۔ متنوع کتبِ تراجم، تذکروں، رضویات اور قدیم و جدید مطبوعات سے جس طرح استفادہ کیا گیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب محض تاثراتی یا جذباتی اردو نثر کا مجموعہ نہیں بلکہ باقاعدہ اکیڈمک تحقیق کے معیار پر لکھی گئی ایک سنجیدہ اور مستند دستاویز ہے، جس میں ادب کا حسن، فکر کی گہرائی اور تحقیق کی دیانت ایک ساتھ جلوہ گر ہے۔

حقیقت بھی اس کتاب کی علمی حیثیت کو مستند بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے کہ اس کی پہلی اشاعت 2019ء میں رضا اسلامک ریسرچ سینٹر [پاکستان] سے ہوئی، بعد ازاں 2022ء میں صراط پبلیکیشنز، [مرادآباد، یوپی] نے اسے نئے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ دونوں ادارے برصغیر میں رضویات اور دینی لٹریچر کی اشاعت کے معتبر مراکز میں شمار ہوتے ہیں، اس لیے اس کتاب کی طباعت و اشاعت بذاتِ خود اس کے علمی وقار اور اعتمادی حیثیت پر دلالت کرتی ہے۔ پوری کتاب ایک سو ساٹھ (160) صفحات پر مشتمل ہے، جو نہ اتنی مختصر ہے کہ محض اجمالی تعارف سمجھا جائے اور نہ اتنی مطول کہ قاری کے لیے بوجھ بن جائے۔ اس کا موجودہ حجم تحقیقی مباحث، تذکاری اشارات اور ادبی تجزیے کے مابین ایک متوازن نسبت پیدا کرتا ہے۔

ظاہری اعتبار سے بھی یہ کتاب نہایت خوش سلیقہ طباعت کی آئینہ دار ہے۔ سرِورق پر سبز و سفید نقش و نگار کے پس منظر میں خانقاہِ بریلی کا عکس، عنوانِ کتاب کے سرخ جلی حروف، اور اس کے نیچے علمی و ادبی جہتوں کی سبز پٹی مل کر ایک ایسا بصری تاثر قائم کرتے ہیں جس میں عقیدت، وقار اور سنجیدہ مطالعہ تینوں کی کیفیت بیک وقت منعکس ہوتی ہے؛ گویا سرِورق ہی سے قاری کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک سادہ کتاب نہیں ایک منظم علمی کاوش کے روبرو ہے۔ نیچے کی جانب قلم، دوات، کتب اور مکتوب کے رمزیہ نقوش اس امر کی حسین علامت ہیں کہ یہ تالیف تحقیق، تحریر اور روایتِ علم کی مشترکہ ترجمانی ہے، اور پبلشر نے گرافک سطح پر بھی مضمون کتاب سے ہم آہنگ ایک سادہ مگر بامعنی جمال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورق اور طباعت کے معیار کے اعتبار سے کتاب ایک سنجیدہ ریسرچ ٹیکسٹ کی تمام بنیادی ضروریات پوری کرتی ہے۔ کاغذ نہایت ہموار، خوش رنگ اور باآسانی قراءت کے قابل ہے۔ حروف کی تراش، فونٹ کا انتخاب اور سطور کا فاصلہ ایسا رکھا گیا ہے کہ طویل مطالعہ کے باوجود آنکھوں پر بوجھ محسوس نہیں ہوتا، حواشی و مراجع کی طباعت بھی متن سے واضح امتیاز کے ساتھ درج ہے جس سے تحقیقی استعمال میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس کتاب کی ظاہری صورت، سرِورق کے ڈیزائن، اندرونی لے آؤٹ اور معیاری طباعت سب مل کر اس امر کا ثبوت ہیں کہ مصنف کی علمی عرق ریزی کے ساتھ ناشر نے بھی ظاہری حسن، سلاستِ قراءت اور استنادی افادیت کو پیشِ نظر رکھا ہے، اور یہی بات اس تالیف کو علمی حلقوں میں بطور ایک سنجیدہ، باوقار اور دیدہ زیب کتاب متعارف کراتی ہے۔

دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ کتاب "خانوادۂ رضا کی علمی و ادبی جہتیں" فکر و نظر کی دنیا میں ایک روشن مینار بن کر ابھرے اور تشنگانِ علم، بالخصوص رضویات کے مسافروں کے لیے بصیرت کا جام ثابت ہو۔ اللہ کرے کہ اس کا ہر ورق قارئین کے ذوقِ لطیف کو جلا بخشے، ان کے دلوں میں نسبتِ رضا کی شمع کو اور فروزاں کرے اور علم و تحقیق کے دامن کو ایسی نایاب موتیوں سے بھر دے جو زمانے کی گرد سے کبھی دھندلا نہ سکیں۔ یہی مؤلف گرامی کی ریاضتِ شبانہ روز کا حقیقی انعام اور ناشر کی محبت بھری کاوش کا اصل حاصل ہوگا۔ ■■■■

صدائے بازگشت

اداریہ نہایت موثر اور دل نشین ہے

ماہنامہ اشرفیہ کا شمارہ دسمبر 2025ء اپنے موضوعات تنوع اور فکری گہرائی کے اعتبار سے ایک جامع اور معیاری علمی وادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے یہ شمارہ قاری کو محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ فکر اخلاق اور عملی زندگی کے کئی پہلوؤں پر سنجیدہ غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے خاص طور پر مہتاب پیامی کی شامل تحریریں اس شمارے کی جان معلوم ہوتی ہیں جنھوں نے دینی اخلاقی اور تاریخی مباحث کو نہایت سلیقے اور وقار کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس شمارے میں شامل مضمون ”حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ ایمانِ کامل کی عملی تصویر“ نہایت مؤثر اور دل نشین ہے اس تحریر میں ایمان کو محض ایک نظری یا زبانی دعویٰ کے بجائے عملی زندگی میں ڈھلی ہوئی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی سادگی، تقویٰ، علم دوستی، خدمتِ خلق اور اخلاقی استقامت کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ قاری کے دل میں عقیدت کے ساتھ ساتھ عمل کی تحریک بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ مضمون اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ ایمانِ کامل وہی ہے جو انسان کے کردار معاملات اور معاشرتی رویّوں میں نمایاں ہو۔ مہتاب پیامی نے نہایت خوب صورتی سے یہ واضح کیا ہے کہ علم عبادت اور اخلاق جب یکجا ہو جائیں تو ایک مثالی اسلامی شخصیت وجود میں آتی ہے، اور حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ اس کی روشن مثال ہیں۔

دسمبر 2025 کے شمارے میں شامل حمورابی اور اس کے قوانین پر مبنی تحریر ایک اہم تاریخی و فکری اضافہ ہے اس مضمون میں قدیم تہذیبِ بابل کے مشہور قانون نامے کو غیر جانب دارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے حمورابی کے قوانین میں عدل سزا و جزا معاشرتی نظم اور شہری ذمہ داریوں کا جو تصور ملتا ہے اسے تاریخی پس منظر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہ تحریر قاری کو یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ انسانی تاریخ میں قانون سازی کا سفر کس طرح آگے بڑھا، اور اسلامی نظامِ عدل سے پہلے دنیا میں انصاف کو کس انداز میں دیکھا جاتا تھا۔ اس تقابلی انداز سے قاری کے ذہن میں عدلِ اسلامی کی جامعیت اور انسان دوستی مزید واضح ہو جاتی ہے۔

مجموعی طور پر ماہنامہ اشرفیہ دسمبر 2025 ایک متوازن اور بامقصد شمارہ ہے جس میں دین تاریخ اخلاق معاشرت اور فکر و نظر کے مختلف زاویے یکجا ہو گئے ہیں۔ مہتاب پیامی کی تحریریں اس شمارے کو فکری وزن عطا کرتی ہیں اور قاری کو مطالعے کے بعد خالی ہاتھ نہیں بلکہ نئے سوالات اور نئے شعور کے ساتھ رخصت کرتی ہیں۔ یہ شمارہ طلبہ علما، اساتذہ اور عام قارئین سب کے لیے یکساں مفید ہے اور یقیناً ماہنامہ اشرفیہ کی علمی روایت کو مزید مضبوط کرتا ہے۔

از: ذوالنورین
نظامی انجمن نورِ حرا، ٹانڈہ

جمعہ کا بیان قوم کا رخ تعین کر سکتا ہے

مکرمی! یہ حقیقت محض ایک تاثر نہیں بلکہ ایک زندہ سچائی بن چکی ہے کہ آج ملک میں مسلمان محض وقتی مسائل نہیں

بلکہ ایک ہمہ گیر فکری و سماجی اور آئینی بحران سے دوچار ہیں۔ یہ بحران باہر سے مسلط نہیں کیا گیا بلکہ افسوس کہ اس کی جڑیں ہماری اپنی کوتاہیوں، غفلتوں اور ترجیحات کی غلط ترتیب میں بھی پیوست ہوچکی ہیں۔ ایسے نازک وقت میں جب ہر سمت سوال ہی سوال ہیں، جب شناخت، بقااور مستقبل ایک ساتھ داؤ پر لگے ہوں تو یہ سوچنا ناگزیر ہوجاتا ہے کہ آخر وہ مقام کون سا ہے جہاں سے قوم کو ایک واضح، دیانت دار اور بیدار کرنے والی رہنمائی مل سکتی ہے۔ اگر دیانت داری سے جائزہ لیا جائے تو جمعہ کا منبر آج بھی وہ واحد پلیٹ فارم ہے جہاں بیک وقت دل و دماغ اور ضمیر سے خطاب کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ ساعت ہے جب مسلمان دنیاوی مصروفیات سے کٹ کر اللہ رب العزت کے گھر میں ایک سمت رخ کیے، ایک آواز سننے کے لیے بیٹھتا ہے۔ یہ لمحہ محض عبادت کا نہیں بلکہ امانت کا لمحہ بھی ہے۔

افسوس کہ اس طاقتور منبر کو ہم نے خود بے سمتی کا شکار بنا دیا ہے۔ آج بھی بے شمار مساجد میں جمعہ کا بیان ایسے موضوعات میں گزر جاتا ہے جو نہ تو غلط ہیں اور نہ ہی بے فائدہ مگر سوال یہ ہے کہ کیا وہ کافی ہیں؟ کیا آج کے حالات میں محض کرامات، حکایات اور ماضی کی داستانیں قوم کو درپیش چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر سکتی ہیں؟ کیا وہ نوجوان جو تعلیم و روزگار اور شناخت کے بحران سے گزر رہا ہے اسے صرف یہ بتانا کافی ہے کہ ماضی میں کیا ہوا تھا بغیر یہ بتائے کہ حال میں کیا کرنا ہے اور مستقبل کے لیے کیا تیاری ضروری ہے؟

ائمۂ مساجد یقیناً ہمارے سروں کا تاج ہیں، ان کا مقام و مرتبہ مسلم ہے مگر یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی ہوگی کہ آج کا امام صرف محراب و منبر تک محدود نہیں رہ سکتا۔ وقت نے اس کردار کو وسیع کر دیا ہے۔ آج امام کو نہ صرف قرآن و حدیث کا عالم ہونا چاہیے بلکہ حالاتِ حاضرہ کا فہم بھی رکھنا چاہیے۔ اسے یہ سمجھنا ہوگا کہ کب خاموشی عبادت ہے اور کب خاموشی جرم بن جاتی ہے۔

آج کے حالات میں بہت سے مسائل پر نہ بولنا دراصل ناانصافی کے ساتھ کھڑا ہونا ہے چاہے نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو۔ یہ کہنا کہ حالاتِ حاضرہ پر بات کرنا سیاست ہے اور سیاست سے دوری ہی دین داری ہے ایک ایسی غلط فہمی ہے جس نے قوم کو بے دست و پا بنا دیا ہے۔ حقائق سے باخبر رہنا، اپنے حقوق جاننا، آئین کے دائرے میں اپنی حفاظت کرنا نہ تو گناہ ہے اور نہ ہی بغاوت بلکہ یہ شعور کی علامت ہے اور یہ شعور اگر کہیں سے پیدا ہو سکتا ہے تو وہ مسجد ہے، وہ منبر ہے، وہ جمعہ کا بیان ہے۔

آج اگر مسجد میں بیٹھا ہوا مسلمان اپنے ہی حقوق سے ناواقف ہے، اگر اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے کاغذات، اس کی زمین، اس کی تعلیم اور اس کی آئینی حیثیت کس قدر اہم ہے تو یہ صرف عوام کی کوتاہی نہیں بلکہ اس منبر کی ناکامی بھی ہے جہاں سے رہنمائی ملنی تھی۔ یہ کہنا کہ عوام خود سمجھ لیں گے، خود سیکھ لیں گے، خود سنبھل جائیں گے ایک ایسی سوچ ہے جو ذمہ داری سے فرار کے مترادف ہے۔ عوام ہمیشہ اسی سمت میں جاتے ہیں جدھر رہنما اشارہ کرتا ہے اور اگر رہنما ہی خاموش ہوجائے تو پھر بھیڑ بھٹکتی رہتی ہے، ٹھوکر کھاتی ہے اور آخر کار تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سچ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ عوام خود بھی بری الذمہ نہیں ہیں۔ جمعہ کا بیان سننا اگر صرف ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے اور اس پر غور و فکر اور عمل کی نیت ہی نہ ہو تو پھر منبر کی آواز بھی بے اثر ہو جاتی ہے۔ قوم صرف اس وقت بدلتی ہے جب سننے والا سنجیدگی سے سننے کے لیے تیار ہو اور بولنے والا سچ بولنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ضروری ہے کہ امام بھی اپنی ذمہ داری کو از سرِ نو پہچانے اور عوام بھی اپنی حالت پر سنجیدگی سے غور کریں۔

از: **حافظ افتخار احمد قادری**
کریم گنج، پورن پور، پیلی بھیت مغربی اتر پردیش

■■■

بوسنیا میں شیخ صفوت خلیلو فیتش کو "حسن افندی شکابور ایوارڈ" سے نوازا گیا

بوسنیا و ہرزگووینا کی اسلامی تنظیم اور مفتیانِ زنیچا (Zenicko muftijstvo) جو اسلامی تنظیم کی ایک شاخ ہے، نے فضیلت مآب شیخ ڈاکٹر صفوت افندی خلیلو فیتش، جو عالمی اتحاد برائے مسلم اسکالرز کی مجلسِ امناء کے رکن ہیں، کو سنہ 1447ھ/2025ء کے لیے "مؤسسۃ حسن افندی شکابور ایوارڈ" عطا کیا۔ یہ اعزاز ان کی نمایاں علمی کامیابیوں اور اسلام و اسلامی ثقافت کی خدمت کے اعتراف میں دیا گیا۔

یہ ایوارڈ جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر دیا گیا، اور اس سلسلے میں 4 ستمبر کو بوسنیا و ہرزگووینا کے شمالی شہر تیشانی (Teshan) میں ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی۔

اس مبارک موقع پر عالمی اتحاد برائے مسلم اسکالرز نے ڈاکٹر صفوت خلیلو فیتش کو دلی مبارکباد پیش کی اور اس بات پر زور دیا کہ یہ اعزاز ان کی علمی اور دعوتی خدمات اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت کے اعتراف کے طور پر بالکل بجا ہے۔

نمایاں علمی خدمات:

ڈاکٹر صفوت خلیلو فیتش بوسنیا و ہرزگووینا کے ممتاز علماء اور محققین میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ یونیورسٹی آف زنیچا کی کلیۂ تربیتِ اسلامی میں پروفیسر ہیں اور علمی و ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کے علوم، سیرتِ نبوی اور قرآنی بشریات (Anthropology) کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے تقریباً بیس کتب تصنیف کی ہیں جن میں سب سے نمایاں:

■ "السيرة النبوية بثوبها الحديد – قراءة عصرية لأحداث السيرة النبوية" (سیرتِ نبوی کی عصری مطالعہ)، جو اب تک دنیا کی 9 زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

البوسنی زبان میں قرآنِ کریم کا مکمل ترجمہ و تفسیر جو پہلی بار مکمل تفسیر کی صورت میں بوسنی زبان میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب غیر معمولی مقبولیت حاصل کرتے ہوئے صرف ایک سال میں 4 ایڈیشنز میں شائع ہو چکی ہے، جو اس کی علمی اور عوامی قبولیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک خصوصی انٹرویو میں ڈاکٹر خلیلو فیتش نے بتایا کہ اس تفسیر کی تیاری میں 11 برس لگے، جس میں ممتاز علما کی ایک جماعت نے تعاون کیا، جن میں: ڈاکٹر احمد الریسونی، شیخ محمد الحسن الددو، ڈاکٹر علی الصلابی اور ڈاکٹر علی محی الدین القرہ داغی شامل ہیں، نیز بوسنیا کے متعدّد علما نے اس کے مختلف مراحل کی نگرانی کی۔

حسن افندی شکابور ایوارڈ کا آغاز 2005ء میں ہوا۔ یہ ایوارڈ ہر سال ان علما اور مفکرین کو دیا جاتا ہے جنھوں نے نمایاں فکری، ثقافتی اور علمی خدمات انجام دی ہوں، اور اس کے لیے ہر سال درجنوں امیدواروں میں سے بہترین شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

شیخ حسن افندی شکابور (1913–1975ء) بوسنیا کے ان ممتاز علما میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے کمیونسٹ دور میں دین و علم کا چراغ روشن رکھا۔ وہ عربی، ترکی، فارسی، روسی اور اطالوی سمیت کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اگرچہ اس دور میں مذہب پر سخت پابندیاں تھیں، پھر بھی انہوں نے بخاری شریف کا تفصیلی شرح کے ساتھ ترجمہ کیا، اور یوں وہ علم و دین پر ثابت قدمی کی علامت بن گئے۔ **(ماخذ: عالمی اتحاد برائے مسلم اسکالرز)**

سرگرمیاں

خبر و خبر

دارالعلوم قادریہ چریاکوٹ میں جشن صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

22 جمادی الآخرہ 1447ھ مطابق 14 دسمبر 2025ء بروز یک شنبہ (اتوار) دارالعلوم قادریہ چریاکوٹ ضلع مئو یوپی میں حضرت مفتی محمد عبدالمبین نعمانی قادری کی زیر سرپرستی دوپہر 12 بجے تاظہر ایک محفل کا انعقاد کیا گیا، یہ محفل (22 جمادی الآخرہ یوم وصال) خلیفہ اول امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں منعقد کی گئی۔

محفل کا آغاز عزیزم محمد اشرف سلمہ کی تلاوت کلام ربانی سے ہوا اور نعت پاک بھی پیش کی گئی پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں ماسٹر فیض عالم چریاکوٹی (استاذ دارالعلوم قادریہ) نے منقبت پیش کی ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت طیبہ پر مولانا محمد عارف رضا نعمانی مصباحی استاذ دارالعلوم قادریہ چریاکوٹ نے مختصراً روشنی ڈالی اور آپ کی حیات طیبہ کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے دین اسلام کے لیے پیش کی گئی آپ کی قربانیوں کا ذکر کیا، جذبۂ ایثار و محبت اور درس صدق و وفا کو بیان کیا، آپ کی افضلیت و خلافت اور صحابیت کا معنیٰ و مفہوم طلبہ کو سمجھایا۔ اپنے بیان میں اس حدیث پاک بھی ذکر کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ابوبکر سے محبت اور ان کا شکر ادا کرنا میری امت پر واجب ہے"، اسی حدیث پاک پر عمل کرتے ہوئے یہ محفل سجائی گئی ہے تاکہ غلامانہ عقیدت کا خراج پیش کیا جاسکے اس گزارش کے ساتھ کہ صحابہ کرام بالخصوص خلفاے راشدین کے ذکر کی محفلیں جگہ جگہ منعقد کی جائیں، تاکہ امت مسلمہ ان نفوس قدسیہ کے ذکر سے اپنے ایمانی جذبے کو مضبوط کرسکے،

آخر میں صلاۃ و سلام اور دعا پر محفل کا اختتام ہوا۔

محفل میں مولانا لئیق احمد برکاتی، مولانا انور علی مصباحی، مولانا حافظ عبدالسلام رضوی، حافظ شمیم احمد، ماسٹر اقبال احمد، ماسٹر نسیم احمد، ماسٹر للو احمد، ماسٹر عبدالمقیت، ماسٹر محمد افضل، ماسٹر فیض عالم، دیگر اساتذہ اور کثیر تعداد میں طلبہ نے شرکت کی۔

رپورٹ: **حافظ شمیم احمد چریاکوٹی**

خادم دارالعلوم قادریہ چریاکوٹ، مئو

ترپورہ: مسجد کی بے حرمتی، شراب کی بوتلیں، شرانگیز نعرے، بجرنگ دل کا جھنڈا برآمد

ترپورہ کے ڈھلائی ضلع میں ایک مسجد کی مبینہ بے حرمتی کی گئی ہے جسے مقامی مسلم سماج کو خوفزدہ کرنے اور تشدد کو ہوا دینے کی جان بوجھ کر کوشش قرار دیا جارہا ہے۔ منوچومانور روڈ پر واقع معینا ما جامع مسجد میں نامعلوم افراد نے جمعرات 24 دسمبر کو شراب کی بوتلیں رکھیں اور مسجد کے کچھ حصوں میں آگ لگانے کی کوشش کی۔ مسجد کے امام کے وہاں پہنچنے پر نماز کی جگہ میں شراب کی بوتلیں ملیں۔ مقامی افراد کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ علاقے کے مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے اور اسلاموفوبیا پھیلانے کی کوشش ہے۔ میڈیا کے پاس موجود نوٹ میں یہ پہلی اور آخری تنبیہ ہے اور اگلی بار کچھ بڑا ہونے والا ہے، جیسے جملے درج ہیں، نیز جے شری رام کے نعرے اور بجرنگ دل کا حوالہ موجود ہے۔ نوٹ بنگالی زبان میں لکھا گیا، "یہ تمھارے لیے تنبیہ ہے۔ ہوشیار رہو اور اچھی طرح سنو۔ چھوٹی سی غلطی بھی معاف نہیں کی جائے گی۔"

بعد ازاں معینا ما جامع مسجد کے امام نے اس واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ "یہ خوف اور بے امنی پھیلانے کی سوچی سمجھی سازش تھی۔ مسجد میں شراب کی بوتلیں رکھنا ہمارے

ایمان کی توہین ہے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ جان بوجھ کر مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے اور تناؤ پیدا کرنے کی کوشش ہے۔" انہوں نے بتایا کہ "خوش قسمتی سے مسجد میں کوئی موجود نہیں تھا کیونکہ ہم پانی ساگر کے علاقے میں ایک پروگرام میں گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ہمیں پتہ چلا کہ مسجد کے کچھ حصوں میں آگ لگائی گئی تھی جو اس وقت تک بجھائی جا چکی تھی۔ وہاں کنگ فشر شراب کی بوتلیں، جے شری رام لکھا پرچم اور دھمکی آمیز نوٹ موجود تھا۔" دریں اثنا انھوں نے بتایا کہ "اس علاقے میں سب سے زیادہ آبادی عیسائیوں کی ہے، پھر بدھ مت اور ہندوؤں کی، اور پھر مسلمانوں کی۔ عیسائی اور بدھ مت کے لوگ ہمارے ساتھ ہم آہنگی، محبت اور احترام کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن بجرنگ دل جیسی تنظیمیں لوگوں کے درمیان دشمنی پیدا کر رہی ہیں۔"

تاہم واقعے کے بعد مسجد کمیٹی نے چومانو پولیس اسٹیشن میں تحریری شکایت درج کرائی۔ مقامی افراد کا کہنا ہے کہ اگر بروقت آگ نہ بجھائی گئی ہوتی تو یہ ایک بڑا سانحہ بن سکتا تھا۔ رپورٹ لکھے جانے تک پولیس کی جانب سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

جے پور میں فرقہ وارانہ تصادم

راجستھان کے شہر جے پور کے مضافاتی علاقے چومئو میں جمعرات 24 دسمبر کی رات کو ایک مسجد کے سامنے سے پتھر ہٹانے کے معاملے میں تنازع کے بعد فرقہ وارانہ تصادم پھوٹ پڑا۔ اس دوران ہونے والے پتھراؤ میں 6 پولیس اہلکار زخمی ہوئے ہیں جس کے بعد بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی ہے۔ جس وقت یہ خبر لکھی جارہی ہے، 10 افراد کو گرفتار کیا جاچکا ہے جب کہ متعدّد زیر حراست ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انٹرنیٹ خدمات کو معطل کر گیا گیا ہے اور علاقے میں اضافی فورس تعینات کردی گئی ہے۔ تشدد کی یہ واردات دیر رات گئے یعنی جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب 3 بجے پیش آیا۔ یہ معاملہ بس اسٹینڈ کے قریب واقع قلندری مسجد کا ہے۔ مقامی اہلکاروں کے مطابق پتھر ہٹانے کا کام اتفاق رائے سے شروع ہوا تھا مگر کچھ لوگوں کے اعتراض پر اس نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرلیا۔ دیکھتے دیکھتے معاملہ اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ سنگ باری ہونے لگی اور پولیس کو آنسو گیس کا استعمال کرنا پڑا۔ واضح رہے کہ قلندری مسجد کے پاس کئی برسوں سے بڑے بڑے پتھر پڑے تھے اور ٹریفک نظام کو درست کرنے کیلئے یہاں سے ان پتھروں کو ہٹانے کا کام چل رہا تھا۔ اسی درمیان شرپسندوں نے از خود پتھر ہٹانا شروع کردیا جس سے علاقہ میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔

جے پور کے ڈی سی پی ہنومان پرساد کا کہنا ہے کہ قلندری مسجد پر کئی روز سے قبضہ پر تنازع چل رہا تھا۔ یہاں دونوں طبقوں کی الگ الگ رائے ہوگئی تھی۔ ایک گروہ اسے ہٹانے پر راضی تھا تو دوسرا گروہ اسے وہیں قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب پولیس قبضہ ہٹا رہی تھی تبھی کچھ لوگوں نے پولیس پر پتھراؤ شروع کردیا جس میں پولیس اہلکاروں کے زخمی ہونے کی اطلاع ہے۔ پولیس کمشنر نے کہا کہ اس معاملہ کے خاطیوں کو ہرگز بخشا نہیں جائے گا اور پولیس قصوروراوں کے خلاف سخت کارروائی کرے گی۔ بتایا جارہا ہے کہ اس معاملہ پر دونوں جانب سے پتھربازی کی گئی ہے اور تنازع اتنا بڑھا کہ پولیس کو آنسو گیس کے گولے داغنے پڑے اور پولیس کی بھاری نفری تعینات کرنی پڑی ہے۔

وزیر اعلیٰ بھجن لال نے پولیس کو جلد اور فیصلہ کن کارروائی کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست میں قانون سے کھلواڑ برداشت نہیں کیا جائے گا اور پتھربازوں پر پھول نہیں برسائے جائیں گے بلکہ انھیں جیل بھیجا جائے گا۔ اسپیشل پولیس کمشنر راہل پرکاش کا کہنا ہے کہ مشتبہ لوگوں کو حراست میں لیا گیا ہے اور اب حالات پرامن ہیں۔ پولیس حکام نے تصدیق کی ہے کہ خاطیوں کی شناخت اور ان کی گرفتاری کیلئے خصوصی ٹیمیں تشکیل دے دی گئی ہیں جو جلد ہی اپنا کام شروع کردیں گی۔ ■■■

خیابان حرم

بزم فروغ نعت، فروغِ نعت کے لیے قائم کی گئی ایک ایسی انجمن ہے جس کے اثرات مبارک پور کی علمی و ادبی فضا میں حالیہ دنوں میں صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں ماہانہ نعتیہ نشستوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً دیگر تقدیسی اصناف پر طبع آزمائی کے لیے مصرعے دیے جاتے ہیں۔ اس بار 20 نومبر 2025 میں عرس حافظ ملت علیہ الرحمہ کی مناسبت سے منقبت کی نشست ہونی تھی، لیکن بعض ناگزیر وجوہات سے یہ پروگرام ملتوی ہوگیا۔ پھر 20 دسمبر 2025 کو پروگرام منعقد ہوا۔ شرکاء نے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی شان میں جو کلام پیش کیے گئے، ان میں سے بعض قارئین اشرفیہ کی خدمت میں پیش ہیں۔ (مہتاب پیامی)

منقبت

جلوۂ مصباحیت پھیلا قریب و دور ہے
حافظ ملت یہ تیرے علم کا سب نور ہے

نائبِ صدر الشریعہ تیرا کردار و عمل
روشنی کی مثل دنیا میں بہت مشہور ہے

ازہرِ ہندوستاں ہے بے گماں یہ جامعہ
بات یہ ہر ایک خاص و عام میں مشہور ہے

سوچنے والے ہمیشہ سوچتے رہ جائیں گے
"کیوں درخشاں آج یہ ارضِ مبارک پور ہے"

جو ہیں دانش گلستانِ حافظ ملت کے پھول
ایسے پھولوں سے جہالت کی خزاں کافور ہے

از: عبدالخبیر دانشؔ

منقبت

نام ان کا میری لوحِ فکر پر مذکور ہے
طائرِ دل اپنی قسمت پر بڑا مسرور ہے

کس بلندی پر ستارہ ہے ترا عبد العزیز
ہر کسی کی فکر سے یہ بات کوسوں دور ہے

کیوں نہ روشن ہو زمانہ علم کی تنویر سے
ہر طرف پھیلا چراغِ جامعہ کا نور ہے

اس زمیں پر کام ہو، زیرِ زمیں آرام ہو
مرد حق آگاہ کا کتنا حسیں دستور ہے

کس کے آنے سے خزاں میں بھی بہاریں آگئیں
کیوں درخشاں آج یہ ارضِ مبارک پور ہے

روشنی حکمت کی اکملؔ بٹ رہی ہے ہر گھڑی
جلوۂ حافظ سے دل کا آئینہ معمور ہے

اکملؔ مبارک پوری

منقبت

امن کا گہوارہ ہے یہ نفرتوں سے دور ہے
بھائی چارہ ہے یہاں پر یہ مبارک پور ہے
حافظ ملت کے در سے فیض پاتے ہیں سبھی
آج بھی احسان ان کا ہر طرف بھرپور ہے
علمِ دینِ حق ہے روشن، دیکھیے، مت پوچھیے
کیوں درخشاں آج یہ ارضِ مبارک پور ہے
مادرِ علمی کو چھوڑیں یہ نہیں ممکن رفیق
اس زمیں پر جینا مرنا سب ہمیں منظور ہے

رفیق مبارک پوری

منقبت

تیرا کردار و عمل ہر آنکھ میں پُر نور ہے
تو سراپا لہجۂ قرطاس پر مذکور ہے
آمدِ پائے مبارک آفریں صد آفریں
پا کے فیضانِ عزیزی ہر کوئی مسرور ہے
دیکھ کر علم و ہنر کی لہلہاتی فصل کو
بالیقیں زرخیزیِ ارضِ نظر مشکور ہے
ساری دنیا جانتی ہے تیری شہرت کی قسم
کیوں درخشاں آج یہ ارضِ مبارک پور ہے

از: امیر اشرف مبارک پوری

منقبت

تذکرہ اس مردِ حق آگاہ کا منظور ہے
جن کے دم سے نازشِ شہرت مبارک پور ہے

اس نے صحرا میں کیا تعمیر اک ایسا محل
جس کے ہر روزن سے چھنتا فکر و فن کا نور ہے

رومی و جامی، غزالی ہے تو اپنے دور کا
تو نگاہِ سنیت میں وقت کا منصور ہے

لوحِ دل پر نقش ہیں آیاتِ قرآنِ مبیں
سینۂ حافظ کلامِ نور سے معمور ہے

جو چھلکتی ہے تمھارے مے کدے میں ساقیا
پی کے وہ صہبا دماغِ زندگی مخمور ہے

نسبتِ غوث الوریٰ کا دل میں روشن ہے چراغ
قادریت کا جہاں میں تو لٹاتا نور ہے

جس نے اشرفیہ کو دیکھا اس پہ روشن ہو گیا
کیوں درخشاں آج یہ ارضِ مبارک پور ہے

آپ نے جو ہے کیا کارِ فروغِ سنیت
با خدا ارشاؔد دل سے آپ کا مشکور ہے

از: ارشاؔد مبارک پوری

منقبت

جو ترے در پر فروزاں حکمتوں کا نور ہے
اس کے فیضِ علم سے دل کا اندھیرا دور ہے

تو جلالت علم کی، تقویٰ کا ہے کوہ گراں
تیرے فیض وجود کا قصہ بہت مشہور ہے

تو ابو الفیض زمن ہے، تو ہے تنویر شرف
تیری شمع علم حق سے سنیت پر نور ہے

ہے مبارک پور میں جس کی طہارت کا اثر
ہاں اسی اک پارسا کا تذکرہ منظور ہے

کس لئے ذرے بنے ہیں آج صد رشک قمر
کیوں درخشاں آج یہ ارض مبارک پور ہے

لکھ کے تیری شان میں اک خوبصورت منقبت
حافظ ملت ، ترا جامؔی بڑا مسرور ہے

از: حافظ نور الزماں جامی

منقبت

مرکزِ علمِ شریعت ، سنیت کا طور ہے
اشرفیہ کی بلندی ہر طرف مشہور ہے
جلوۂ مصباحیت ہے خود جواب اس بات کا
کیوں درخشاں آج یہ ارضِ مبارک پور ہے

از: بلال اشرفی مبارک پوری

منقبت

وہ ابو الفیض و حکم ہے ہر طرف مشہور ہے
علم کا خاقان ہے، سلطان ہے، فغفور ہے

اس کے افکارِ جلی میں جلوۂ عشقِ نبی
اس کے اذکارِ خفی میں سوزِ دل مستور ہے

وہ حدیث و فقہ میں ٹھہرا ہے یکتائے زمن
اس کے آگے فلسفہ معذور ہے، مجبور ہے

اس کی ہر تحریر ہے آئینۂ افکارِ حق
اس کی ہر تقریر میں حکمت بھرا دستور ہے

محوِ حیرت ہیں ابھی تک نیل، گنگا، کاشغر
ساحلِ تمسا پہ آخر کس دیے کا نور ہے

حافظِ ملت وہ مردِ حق کہ جس کے سامنے
آج تک ہر شیخئ شیخ ہَوا کافور ہے

دیکھ مہرِ سیرتِ حافظ ، دلِ ناداں نہ پوچھ
کیوں درخشاں آج یہ ارضِ مبارکپور ہے

ایک چوتھائی صدی سے اس میں میں ہوں مجھ میں وہ
مجھ سے کب ان کا دیارِ علم وحکمت دور ہے

کچھ نہیں خوفِ خزاں کچھ ڈر نہیں صیاد کا
مطمئن ان کے گلستاں میں دلِ عصفور ہے

از: مہتاب پیامی

R.N.I. No. 29292/76
Regd. No. AZM/N.P.28 2023-25

THE ASHRAFIA MONTHLY

Mubarakpur Azamgarh (U.P.) 276404 (INDIA)

(Mob. No.) 9450109981 (Mumbai Office) 022-23726122 (Delhi Office) Tel. 011-23268459, Mob.No. 9911198459

www.aljamiatulashrafia.org Email: info@aljamiatulashrafia.org

FEB 2026

2026

اشرفیہ کلینڈر

حاصل کرنے کے لیے

رابطہ کریں:

منیجر ماہ نامہ اشرفیہ

9935162520